مشمولات

(اداریہ)

امیر سنی دعوت اسلامی کے قلم سے

اسوۂ نبوی اور عالمی حالات

بگڑتے ماحول اور خراب ہوتے حالات میں اسوۂ نبوی سے ہی دنیا کو سکون مل سکتا ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر لمحہ اور ہر پہلو پوری اُمت مسلمہ کے لیے ایک کامل اُسوہ اور مکمل نمونہ ہے۔قرآن کریم میں ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب:۲۱) ترجمہ: بے شک تمھیں رسول اللہ کی پیروی بہتر ہے۔(کنز الایمان)

حضور رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی ہو یا سماجی زندگی، مکی زندگی ہو یا مدنی زندگی، عبادات ہوں یا معاملات، سیاسیات ہوں یا اخلاقیات و مذہبیات، آپ کی زندگی کا عملی نمونہ ہر شعبۂ زندگی میں تمام انسانوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے جو اس ملک میں اقلیت میں ہیں ایک مکمل عملی نمونہ موجود ہے۔ یہ ملک ہم مسلمانوں کا اپنا محبوب وطن ہے، ہمارے باپ دادا اسی خاک میں دفن ہیں اور اس برصغیر میں ہماری تہذیب وتمدن اور تاریخ وروایات کے کتنے ہی انمٹ نقوش ثبت ہیں کہ اگر اس گراں قدر تہذیبی، ثقافتی وتاریخی ورثے کو ہندوستانی تاریخ سے مٹا دیا جائے تو یہاں کی تاریخ بے کیف و بے نور نظر آئے گی۔

آج کا مسلمان مکی دور سے قریب ہے۔عالمی حالات کا دیباچہ یہ بتا رہا ہے کہ آنے والے دن ایمان پر ثابت قدمی اور استقامت فی الدین کے حوالے سے بہت کٹھن ہوں گے۔ویسے بھی اُمت مسلمہ کی بے علمی و بے عملی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ زبان سے کفریہ کلمات بولنا عام ہوتا جارہا ہے اور ہماری حرکات وسکنات بھی کفر وضلال کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔

مکی زندگی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی شناخت آپ کی صاف ستھری اور پاکیزہ زندگی تھی۔آپ کی صداقت وامانت، شرافت و پاکیزگی، تواضع وانکساری اور تقوی و پاکبازی کا ہر باشندہ قائل تھا۔آپ کو عام طور پر صادق وامین کہا جاتا تھا۔تعمیر کعبہ کے وقت حجر اسود کی تنصیب میں قریش کے اندر جو سخت اختلاف پیدا ہوا اور جس کی وجہ سے خوں ریز جنگ چھڑنے والی تھی، وہ آپ کی جوانی کا زمانہ تھا، لیکن قریش کے سرداروں اور بڑے بوڑھوں کو جب یہ ہاشمی نوجوان دکھائی پڑا تو سب نے بیک آواز ہوکر کہا: هٰذَا مُحَمَّدُ الأَمِيْنُ رَضِيْنَا هٰذَا مُحَمَّدُ الأَمِيْنُ (یعنی یہ محمد امین شخص ہیں، ہم ان سے خوش ہیں، یہ امین ہیں)۔اور سب نے اس نوجوان کے حکیمانہ فیصلے کو بخوشی قبول کیا اور اس طرح ایک خون ریز جنگ چھڑتے چھڑتے رہ گئی۔(سیرۃ المصطفیٰ ۱:۱۱۶، بحوالہ سیرت ابن ہشام)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کا دوسرا سب سے واضح پہلو آپ کا بے پناہ جذبۂ صبر واستقامت، اولوالعزمی اور اپنے صحیح موقف پر پہاڑ کی طرح قائم رہنا تھا۔تبلیغ ودعوت حق کے بعد مکہ کی اکثریت آپ کے خلاف تھی۔وہ ہمیشہ آپ کے اور مٹھی بھر مسلمانوں کے درپئے آزار رہتے، انھیں تکلیفیں پہنچاتے، اور دن رات اسلام، پیغمبر اسلام اور متبعین اسلام کے خلاف سازشیں کرتے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار مکہ کے اس برتاؤ کا جواب صبر وخاموشی اور ہمت واستقامت سے دیا۔آپ نے دعوت حق کے اپنے موقف سے ذرہ برابر پیچھے ہٹنا گوارا نہیں کیا، حتی کہ آپ کو پورے عرب کی بادشاہت، مال ودولت، حسین ترین عورتیں اور خواہش کی ہر چیز پیش کیے جانے کی پیش کش بھی کی گئی، لیکن آپ نے اس دعوت حق کے سامنے ہر پیش کش کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔آپ نے اس صبر آزما اور مخالف ماحول میں اہل مکہ کے سامنے اعلی اخلاقی نمونہ پیش کیا۔گالیوں کا جواب دعاؤں سے، پتھر کا جواب نرم کلامی سے، دل آزاری کا جواب ہمدردی سے دیا۔آپ نے اس ماحول میں تصادم سے گریز کیا اور حکمت وبصیرت کے ساتھ کام کرتے رہے۔لوگوں کی بھلائی اور دنیا وآخرت کی کامیابی کے لیے ان کو خدائے واحد اور اللہ کے پسندیدہ دین کی طرف بلاتے رہے۔ دعوت وتبلیغ کا جو فرض منصبی آپ نے اٹھایا تھا، اس پر پوری دلجمعی اور سختی سے قائم رہے۔یہی وجہ تھی کہ آپ کی دعوت دلوں کے قلعوں کو تسخیر کرتی چلی گئی اور مکہ کی ایک بڑی تعداد نے مخالف ماحول میں بھی اسلام میں کشش محسوس کی۔ جو لوگ کل تک آپ کے مشن کے شدید ترین دشمن تھے، وہ آپ کے اخلاق عالیہ اور دعوت حق کی گرمی سے پگھل کر پانی پانی ہوجاتے اور اہل ایمان کے حلقے میں شامل ہوجاتے۔

سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سے یہ چند خاص سبق ملتے ہیں کہ اہل ایمان کو اپنے حق وصداقت کے موقف پر پورے یقین واعتماد کے ساتھ جمنا چاہیے اور اس کی طرف پر پورے وثوق کے ساتھ دعوت دینی چاہیے۔ جہاں تک ہو سکے اپنے پڑوسیوں، اہل خاندان، اہل وطن سے خواہ وہ کسی بھی فکر و خیال اور مذہب کے ماننے والے ہوں، ان سے اخلاق ومحبت، خیر خواہی وہمدردی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔نیز معاشرے کے سامنے ہمیشہ اپنے اعلی کردار وعمل، تقوی وطہارت، امانت ودیانت اور اخلاص وخیر خواہی کے ذریعہ بلند پایہ اخلاقی اقدار وآداب کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ ●●

قرآن مجید اور ثقافت

قرآنی ثقافت ایسی طرز حیات کا نام ہے جس نے ''معاشرتی حیوان'' کو 'اخلاقی وجود' میں تبدیل کر دیا

از: پروفیسر ڈاکٹر انیس احمد

قرآن جس ثقافت کا تصور پیش کرتا ہے اس کی ابتدا انکارِ علم یا تشکیک کی جگہ اثباتِ علم سے ہوتی ہے۔ تخلیقِ آدم کے واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملائک (فرشتوں) کو خصوصی علم عطا کیا ہے لیکن انسان کا علم بعض معاملات میں ملائک سے بھی زیادہ ہے۔

ایمان علمِ حقیقی یا حقیقتِ عظمیٰ کا نام ہے۔ چنانچہ توحید کا اقرار اور شرک کا ابطال، حی و قیوم ہونے کا علم اور اَلْعَزِيزُ الْجَبَّارُ، رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ، مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اور رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ تسلیم کیے بغیر کسی شخص کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔ قرآن میں اسلامی ثقافت کو تین بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے یعنی توحید، رسالت اور آخرت۔ توحید گویا کائنات اور خالقِ کائنات کے بارے میں اس اعلان کا نام ہے کہ اس کائنات کا خالق و مربی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ اپنی ذات اور صفات کے اعتبار سے یکتا اور اپنے اختیارات کے اعتبار سے سب سے بلند و برتر ہے۔

انسان عبدِ محض ہے۔ انسان کو عبد قرار دینے کے بعد قرآن اس عبد کو بہترین عبد بنانے اور انسانی تہذیب و ثقافت کے نشوونما کے لیے نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی روشن شخصیت کو بطورِ اُسوہ کے پیش کرتا ہے۔ نبی معاشرے کا صالح، اکمل ترین اور جامع الصفات فرد ہوتا ہے۔ وہ چوں کہ خود ایک معاشرتی زندگی گزارتا ہے اس لیے صرف اسی کا عمل دوسروں کے لیے رہنما بن سکتا ہے۔ اسلامی ثقافت میں فرد کا معیارِ مطلوب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو قرار دیا گیا ہے۔ اس کائنات کے بارے میں تصورات کی اصلاح کرنے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہادی و رہنما قرار دینے سے اسلام کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ایک صالح معاشرہ وجود میں آسکے اور انسان ایک متوازن ومعتدل زندگی گزار سکے۔ اسلامی ثقافت میں کشاکشِ حیات کا مقصد ومنتہا اُخروی زندگی کی کامیابی کو قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ اسلامی ثقافت کم تر سے بلند اور بلند تر منزل کی طرف ارتقا کرتی ہے۔ ایک طرف تو تصورِ آخرت انبیا کو جامع و بلند نصب العین فراہم کرتا ہے اور دوسری طرف یہ تصور ایک ایسی مشترک بنیاد فراہم کرتا ہے جس کے نتیجے میں بلاتفریق رنگ ونسل ولسان ایک اُمت وسط عالمِ وجود میں آتی ہے جو جغرافیائی اور طبعی حدود و قیود سے ماورا تہذیبی یک جہتی کی بنیاد پر ایک عالم گیر معاشرے کے قیام کے لیے کوشاں ہوتی ہے۔

قرآن کی دی ہوئی ثقافت کی یہ تین بنیادیں (توحید، نبوت و آخرت) فرد اور معاشرے کو کمال، خوشی، فرض اور دیگر مقاصدِ حیات کے محدود نظریات کی پستی سے نکال کر حقیقی خوشی، صداقت اور کمال کی رفعتوں سے ہم کنار کرتی ہیں۔

اسلامی ثقافت ایک ہمہ گیر ثقافت ہے، یہ محض چند نفوس کی ذاتی اصلاح اور تربیت تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ اپنے تمام ماننے والوں کو رشتۂ اُخوت و ایمان میں جوڑ کر صالح معاشرے کی تعمیر اور عدلِ اجتماعی کی بنیاد پر انسانی برادری کی تشکیلِ نو کرتی ہے۔ اسلامی ثقافت افراد کے درمیان فلاح اور خیر کو مشترک بنیاد قرار دیتی ہے۔ یہاں پر مسابقت ہے مگر نیکی، شرافت، تعلق باللہ، اطاعتِ رسول اور ادائیگیِ حقوق میں۔ اسلامی ثقافت انسانی زندگی کے ہر گوشے اور ہر عمل کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ زندگی کے ہر عمل میں خواہ اس کا تعلق سیاست سے ہو، معیشت سے ہو، یا معاشرے سے ہو، خواہ ایک شخص کی گھریلو اور خانگی زندگی ہو یا بین الاقوامی مسائل، غرض ہر مسئلے اور ہر معاملے میں اسلامی تہذیب رہنما اصول فراہم کرتی ہے۔ یہ اصول جس طرح فرد کی زندگی کی اصلاح کرتے ہیں بالکل اسی طرح معاشرے، ریاست اور بنی نوع انسان کی فلاح کی ضمانت بھی دیتے ہیں۔

ماخذ ثقافت:

اسلامی ثقافت خود کو ایک الٰہی تہذیب قرار دیتی ہے اور قرآن اس الٰہی تہذیب میں ماخذِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کسی خاص نسل، قوم یا خطے کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ یہ تمام انسانوں کے لیے

ضابطۂ حیات اور دستور کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کی بنیاد پر جو آفاقی ثقافت عالمِ وجود میں آتی ہے وہ تمام تعصّبات کو نظر انداز کرتے ہوئے بنی آدم کو اتحادِ فکر و عمل کے ذریعے ایک عظیم تر انسانی معاشرے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ دنیا کی کسی اور تہذیب یا ثقافت میں یہ آفاقیت اور ہمہ گیری نہیں پائی جاتی۔ اسلامی ثقافت بنیادی طور پر قرآنی ثقافت ہے۔ یہ معاش و معاد، حلال و حرام اور جائز و ناجائز، غرض تمام مسائل میں قرآن کو رہنما قرار دیتے ہوئے احکامِ الٰہی کے سامنے کامل سپردگی کا رویہ اختیار کرتی ہے۔ کتاب کو ماخذ مان لینے کے بعد اسلامی ثقافت اس ہستی کو جس پر یہ کتاب نازل ہوئی، مفسرِ کتاب اور شارحِ کتاب کا مقام دیتی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ماخذِ ثانی قرار دیتی ہے۔ چنانچہ قرآن کے عطا کردہ اُصول اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے چھوڑے ہوئے اُسوے میں دو بنیادی ماخذ ہیں جن پر اسلامی تہذیب کے قصر کی تعمیر ہوتی ہے۔

زبان و ادب:

اسلامی ثقافت کی ان دو بنیادوں کے مختصر ذکر کے بعد اب ہم ثقافت کے ایک اہم پہلو، یعنی ذریعۂ اظہار کو لیتے ہیں۔ انسانی معاشرہ جن عناصر کے سہارے وجود میں آتا ہے زبان ان میں سے ایک اہم ذریعہ ہے۔ ایک لمحے کے لیے زبان کو معاشرے سے الگ کر دیجیے۔ حُسن، رنگ و بُو، رعنائی و نیرنگی، غرض تمام جسمانی اور نفسیاتی تجربات یکا یک وجود سے عدم میں چلے جائیں گی۔ قرآن کی زبان الہامی و توقیفی ہے۔ گو، قرآن کے بیش تر الفاظ لغتِ انسانی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اپنی بلاغت، ادبیت اور اعجاز کے اعتبار سے یہ اپنی مثال آپ ہیں۔ گویا خالص زبان کے نقطۂ نظر سے بھی قرآن بلند ترین ادبی خصوصیات کا حامل ہے۔

قرآن کے ہر کلمے میں زبردست اثر انگیزی ہے۔ قرآن اپنے نظریۂ ادب کی بنیاد کائنات کی ٹھوس حقیقتوں پر رکھتا ہے اور اظہار کے لیے صحتِ فکر اور عصمتِ خیال کو لازمی قرار دیتا ہے۔ اگر حُسن کا معیار معلوم کرنا ہو تو حضرت یوسف کے حالات دیکھیے۔ اگر ہجر کی لذتوں کا اندازہ کرنا ہے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی کیفیات سے گزریئے۔ اگر صبر و قناعت کا مشاہدہ کرنا ہے تو حضرت ایوب علیہ السلام کی واردات کا مطالعہ کیجیے۔ اگر استقامت کا مفہوم سمجھنا ہے تو راتوں کو جاگنے والے اور کمبل میں لپٹنے والے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی ورق گردانی کیجیے، غرض جہنم میں لکڑیاں ڈھونے والی ابولہب کی بیوی سے لے کر حُورانِ بہشت تک ہر مضمون اور ہر موضوع پر زبان و ادب کے مکمل ترین شاہکار قرآنِ پاک میں موجود ہیں۔ ضرورت صرف دیکھنے والی آنکھ، محسوس کرنے والے دل و دماغ، اور سننے والے کان کی ہے۔

قرآن کریم کے زیر اثر وجود میں آنے والی ادبی روایت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ قرآن نے عربی زبان کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ اس پہلو سے دنیا کی کوئی تمدنی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ نزولِ قرآن سے آج تک اس زبان کا ادب قرآن کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس کے محاورے، روزمرہ اور الفاظ کے استعمالات میں وہ بنیادی تبدیلیاں واقع نہیں ہوئی ہیں جو دنیا کی ساری زبانوں میں گردشِ زمانہ کے ساتھ ساتھ رُونما ہوتی رہتی ہیں، اور نتیجتاً ایک دَور کی زبان اور اس کا ادب دوسرے دور کے لیے اجنبی اور غیر مانوس ہو جاتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ قرآن کریم نے عربی زبان کو عالم گیریت سے نوازا بلکہ قرآن کی وجہ سے عربی زبان کے ہزاروں الفاظ دنیا کی دوسری زبانوں میں شامل ہوئے اور ثقافتی اتصال کا ذریعہ بنے۔

شاعری:

اسلامی ثقافت کے زیر اثر وہ عرب شعرا جو زُلفِ گرہ گیر، نگہ نیم باز، خنجر و ابرو، لب و رُخسار، اور حُسن و عشق کی حکایات کے لیے مشہور تھے، اب حمد باری تعالیٰ، منقبتِ رسول، فضائلِ اخلاق، حکایات اور سلوک و معرفت کی منازل جیسے موضوعات پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ قرآن نے شرم و حیا، پاک بازی و عفت کے تصورات دے کر عرب شاعری کو حجاب کی چادر اُوڑھا دی۔ بلاشبہہ قرآن شعر نہیں ہے لیکن اس کا اُسلوب اپنی مثال آپ ہے۔ وہ ایسی نثر ہے جس میں شعر کا بانکپن ہے۔ شعریت کا حُسن اس کی سطر سطر سے نمایاں ہے۔ اس خاص اسلوب نے صرف عربی ادب کو متاثر نہیں کیا بلکہ دنیا کی جن جن زبانوں تک قرآن کا پیغام پہنچا ہے انھوں نے اس سے اثر لیا ہے۔ الفاظ، تراکیب اور جملوں کی ترتیب بھی اس سے متاثر ہوئی ہے اور محاورے، تشبیہات، استعارے بھی، غرض ہر ہر چیز کو قرآن کے اسلوب نے متاثر کیا ہے، گو عربی قرآن کی زبان ہے خود اُردو پر اس

کے اثرات کی ہزاروں مثالیں دی جاسکتی ہیں بلکہ سچ تو یہ ہے کہ قرآن کی حیثیت صرف متاثر کرنے والے کی نہیں بلکہ اس پہلو سے بھی معیار کی ہے۔

رسم ورواج:

قرآن نے قدیم رسوم ورواج کی مناسب اصلاح کی اورصرف ان رسوم کو باقی رکھا جو اسلام کے بنیادی تصورات سے متعارض نہ تھیں۔ چنانچہ وہ تمام رواج جو انسان کی فطرت سے مناسبت نہیں رکھتے تھے یا جو اعلیٰ اخلاقی اصولوں سے ٹکراتے تھے اورصدیوں سے عربوں کی گھٹی میں پڑے ہوئے تھے، قرآنی ثقافت نے انھیں یک قلم منسوخ کر دیا مثلاً غم کے موقعے پر بین کرنا، بال بکھیر کر چہرہ پیٹنا، ایامِ حج میں ستر کو ظاہر کرنا، جسم کو گودنا اور ایسا بناؤ سنگھار کرنا جس سے زینت ظاہر ہو اور نامحرموں کے لیے کشش پیدا ہو، منع فرمایا۔ قرآن نے ایسی تمام رسوم ورواج کو تبرج جاھلیۃ سے تعبیر کیا ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ کے موقعے پر بے جا اظہارِ شان وشوکت اور دھوم دھڑکے کو ناپسند کرتے ہوئے فرماں روائے عرب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی صاحب زادیوں کی شادی جس سادگی اور قناعت کے ساتھ فرمائی وہ اُمتِ مسلمہ کے لیے ایک زندہ مثال کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس طرح قرآن نے قومی روایت کو رطب و یابس اور منکر سے پاک کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ صحت مند روایت کو معاشرے کا ایک جزو بنایا اور اسے معروف سے تعبیر کیا یعنی وہ چیز جو جانی پہچانی طور پر اخلاقی ہے۔ اس طرح یہ عظیم تصور دیا کہ دراصل نیکی انسان کی فطرت ہے اور انسان معاشرے کی اصل روایت ہے۔ اُن نیکیوں کو جنھیں اسلام قائم کرنا چاہتا ہے، قرآن ان کو 'معروف' کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور یہ وہ بلند ترین مقام ہے جو کسی نظام میں روایات کو دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح دوسرے مقامی تعامل میں سے وہ چیزیں جو اسلام کی تعلیمات سے متصادم نہ ہوں اور اس کی روح سے مطابقت رکھتی ہوں، ان کو اسلام اپنے نظام میں ضم کر لیتا ہے اور انھیں 'عرف' قرار دیتا ہے۔ پھر قرآن خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کو مسلمانوں کا دائمی طریقہ بناتا ہے اور یہ سنت مسلم معاشرے کی زندہ روایت بن جاتی ہے۔ ہماری تمدنی زندگی میں ان روایات کی حیثیت وہی ہے جو کشتی کے لیے لنگر کی ہوتی ہے۔ اس طرح قرآن نے ہمارے تمدن اور ہماری ثقافت کے چاروں گوشے بھی مقرر کیے اور اس کے ارتقا اور اس کی ترسیل کے لیے بہترین راستے بھی متعین کر دیے۔

معاشرت:

قرآن جس معاشرے کا تصور پیش کرتا ہے اس کی بنیادی خصوصیت، معاشرتی عدل ہے، یعنی افراد کے حقوق کا تحفظ، امداد باہمی وتعاون، اُخوت اور بھائی چارہ اور ضروریات وحاجات کی فراہمی۔ قرآن معاشرتی زندگی کی بنیاد حُرمت اور عصمت کے تصورات پر رکھتا ہے اور متعین طور پر حرام رشتوں کی نشان دہی کر دیتا ہے۔ قرآن کے قائم کردہ نظامِ عصمت وعفت میں تمسخر، تہمت، عیب جوئی، بدگمانی، بدنامی اور غیبت کے دروازے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیے گئے۔

گھریلو زندگی کو ہر قسم کے شک وشبہہ اور مناقشات واختلافات سے پاک رکھنے کے لیے اتنی احتیاط برتی گئی کہ گھروں میں داخلے کے وقت اجازت کو ضروری قرار دیا۔ افراد کے تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے انھیں مختلف قبائل وشعوب میں بانٹا لیکن جہاں تک انسانی حقوق وفرائض کا تعلق ہے اس میں کوئی تفریق نہیں برتی۔ حتیٰ کہ غلاموں کو جو دنیا کی کسی بھی تہذیب میں عام انسانوں کے برابر نہیں سمجھے گئے، اسلامی ثقافت میں انھیں بھی یکساں بنیادی حقوق فراہم کیے گئے اور غلام سازی کو روکنے کے لیے اخلاقی اور قانونی ضوابط کو متعارف کروایا گیا۔ قرآن کے اس بنیادی نقطۂ نظر کا یہ اثر ہے کہ اس میدان میں بھی ہمارے ثقافتی مظاہر دوسروں سے بہت مختلف ہیں۔ فحش کلامی اور گالم گلوچ کے لیے یہاں کوئی گنجایش نہیں۔ غصہ اور اختلاف کے اظہار کے لیے یہاں اِتَّقُوا اللّٰہَ اور یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ کے کلمات استعمال ہوتے ہیں۔

امام غزالی لکھتے ہیں کہ اگر اہلِ مدینہ کو کسی کو گالی دینی ہوتی تو کہتے کہ تجھے جمعہ کا غسل نصیب نہ ہو، یعنی ایک نیکی تجھ سے چھوٹ جائے۔ ایسی نیکی جو فرض کے درجے کی نہیں ہے۔ اہلِ عرب آج تک دوسرے کو اپنی طرف متوجہ کرانے کے لیے یا اس کی بات کاٹتے وقت اَطَالَ اللّٰہُ عُمْرَکَ (اللہ تیری عمر میں اضافہ کرے) کہتے ہیں۔ قرآن نے کہا کہ والدین کو اُف تک نہ کہو، اور توجہ دلائی کہ تم ان کا احسان نہیں اُتار سکتے۔ ان عالم گیر اور آفاقی واخلاقی اصولوں کی روشنی میں خاندانی اور اجتماعی آداب کا ایک مکمل نظام تیار کیا۔ معاشرتی زندگی

کے یہ تمام ثقافتی مظاہر قرآن ہی کا عطیہ ہیں۔

اکل وشرب اور لباس:

بھوک کا رفع کرنا انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔قرآن انسانوں کو صرف روحانی غذا ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ انھیں خورد ونوش کے طریقے بھی سکھاتا ہے۔قرآن نے غذا کو حلال وحرام کی دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے اور دیگر معاملات کی طرح یہاں بھی ان اشیا کی نشان دہی کر دی ہے، جو انسان کے لیے مضرت رساں ہیں۔اس کے ساتھ ہی ایک عمومی اصول یہ بھی بیان کر دیا ہے کہ جن اشیا پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اور جو ممنوعات میں سے نہ ہوں ان کا استعمال جائز ہے۔ قرآن نے حلال وحرام کے دائرۂ کار کو وسعت دے کر زندگی کے تمام معاملات کو، خواہ وہ انتہائی ذاتی ہوں یا معاشرتی، معاشی ، سیاسی یا ثقافتی،ان دو الفاظ کے ذریعے اچھائی اور بُرائی میں تقسیم کر دیا۔ چنانچہ حلال وحرام کا اطلاق محض خورد ونوش پر نہیں بلکہ زبان سے کیا لفظ ادا کرنا ہے،کان سے کون سی بات سننی ہے، ہاتھ کس جانب بڑھنا ہے، پاؤں کو کس طرف حرکت کرنی ہے، معاملات کس طرح طے کرنے ہیں،غرض حلال وحرام کی بنیاد پر ایک اخلاقی تہذیب کا وجود صرف اور صرف قرآنِ کریم کا کارنامہ ہے۔

قرآن نے قبل از اسلام کے طور طریقوں،جن میں بعض غذاؤں کا صرف مردوں کے لیے مخصوص ہونا یا بعض حلال غذاؤں کو اپنے اُوپر حرام قرار دے لینے سے منع فرمایا اور اس طرح انسانوں کو کفرانِ نعمت سے روکا۔ غذا کی طرح لباس بھی ایک اہم انسانی ضرورت ہے۔قبل از اسلام کی ثقافت میں تن کی عریانی ہی لباس بن چکی تھی حتیٰ کہ حرمِ کعبہ میں برہنہ طواف کرنا ایک عام عادت بن چکی تھی۔قرآن نے لباس کے سلسلے میں اصول بیان فرمایا کہ وہ ساتر ہو، پاک صاف ہو، سادہ ہو اور دوسری اقوام سے مختلف ہو۔ چنانچہ دورِ نبوی کے معاشرے پر نظر ڈالیے تو یہی اصول کار فرما نظر آتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی سادہ بالعموم سفید لباس پسند فرماتے تھے۔آپ نے مردوں کے لیے ایسے لباس کو پسند کیا جو مشقت ومحنت میں حارج نہ ہو اور جس سے تکبر پیدا نہ ہو۔ چنانچہ ریشمی اور قیمتی لباس پہننے کو ناپسند فرمایا۔ بلاشبہ لباس کے تعین میں آب وہوا اور مقامی اثرات کا خاصا دخل ہے لیکن قرآن کے تصورات نے دنیا کے تمام ملکوں میں مسلمانوں کے لباس کا ایک خاص رنگ قائم کر دیا۔ اس میں سادگی، طہارت، نظامِ عبادات سے ان کی مناسبت کے ساتھ حُسنِ ذوق اور سلیقہ کو بھی ایک خاص مقام حاصل ہے۔

خاص مواقع پر پہننے والے لباس پر قرآن کی موزوں آیات کی کتابت بھی مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔اس کا رواج اتنا بڑھا کہ غیر مسلم پادری تک خاص مواقع پر وہ کپڑے استعمال کرنے لگے جن پر عربی الفاظ لکھے ہوئے ہوتے تھے۔مشہور مؤرخ رابرٹ بریفا رلٹ اپنی کتاب تشکیلِ انسانیت میں اس کا ذکر کرتا ہے۔آج بھی اشبیلہ کے میوزیم میں ایسی کپڑے پر کاڑھی ہوئی منقش تصاویر (Tapesteries) موجود ہیں جن میں عیسائی پادری وہ چوغے پہنے ہوئے ہیں جن پر قرآنی الفاظ مثلاً لَا غَالِبَ اِلَّا اللّٰہ تحریر ہیں۔ شاید اسی کیفیت کو اُردو محاورے میں ’جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے‘ کہا گیا ہے۔

فنون:

مفسّرین کا خیال ہے کہ قرآن میں جملہ علوم وفنون کے لیے بنیادیں موجود ہیں۔ چنانچہ قرآن نے جا بجا غور وفکر کرنے اور تحقیق و جستجو اور تلاش کرنے کی تعلیم دی ہے۔اگر غور کیا جائے تو محض قرآن کی بنا پر بہت سے فنون وجود میں آئے،مثلاً فنِ قراءت،فنِ تجوید،فنِ کتابت،فنِ کاغذ سازی اور دیگر قسم کے ورق،طغرا نویسی، آرایشی و ہندسی خطوط،اُبھارواں وکندہ خطوط،فنِ جلد سازی وغیرہ۔

قرآن کی حفاظت کا وعدہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا لیکن مسلمانوں نے مزید احتیاط کے پیشِ نظر قرآنِ پاک کے الفاظ ومعانی کے تحفظ کے لیے فنِ تجوید وقراءت کو فروغ دیا تا کہ مختلف اقوام کے اختلاط سے (جن کے لہجے ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے) قرآن کے الفاظ متاثر نہ ہوں۔ گو، اسلام نے موسیقی کو پسند نہیں کیا لیکن حُسنِ صوت کی اہمیت کو تسلیم کیا۔مسلمانوں نے خوش الحانی کے ساتھ قرآن کو پڑھنے کے ذریعے ذوقِ نغمہ کی تسکین بھی کی اور روح کے تغذیہ کا سامان بھی بہم پہنچایا۔

قرآن نے بت پرستی،لہو ولعب اور ہر قسم کے شرک کی نفی کی تھی۔ اس لیے اس کے ماننے والوں کے فنون میں قرآن کی ان ہدایات کا عکس نظر آتا ہے۔تصویر کشی عرب جاہلیہ میں بالکل عام تھی لیکن اسلامی ثقافت میں انسانی شبیہہ اور ذی حیات اجسام کی تصویر کشی کی جگہ ہندسی نمونے،خطِ صغریٰ اور قرآنی آیات کے انتہائی

خوش نظر نمونے بنائے جانے لگے۔ اوّل اوّل قرآنی آیات پتھروں پر کندہ کی گئیں لیکن دورِ عباسی میں فنِ تعمیر میں وسعتوں کے ساتھ عمارتوں پر ہونے والے پلستر پر، جب کہ وہ تازہ اور نرم ہوتا، سانچوں اور فرموں کی مدد سے آیاتِ قرآنی کے ابھارواں نقوش بنائے جانے لگے۔ نہ صرف یہ بلکہ ایسے قیمتی کپڑے تیار کیے جاتے جن میں سونے کے تاروں سے قرآنی آیات کاڑھی جاتیں اور ان کو رواج عام حاصل ہوا۔ بالعموم مساجد کے دروازوں، محرابوں، چھت کے گرد، منبروں اور چمڑے کے دبیز پردوں پر انتہائی خوب صورت خط میں قرآنی آیات لکھی جاتیں اور نئے نئے نمونے اور شکلیں بنائی جاتیں۔

قرآن کو تحریری شکل میں زیادہ مدت تک محفوظ رکھنے کے لیے قسم قسم کے کاغذ اور دیگر سامانِ کتابت کی ایجاد ہوئی۔ چنانچہ کاغذ کے علاوہ جس کی عمر بہت محدود تھی، اریم، یعنی باریک کھال کی جھلی، سفید رنگ کے پتھر کی پتلی پتلی اور چوڑی تختیاں (ہمارے یہاں کی سلیٹ سے مشابہ)، کتف، یعنی اُونٹ کے مونڈھے کے پاس سے تراشی ہوئی گول اور پتلی پتلی تختیاں، کھجور کی شاخوں کے چوڑے حصے سے نکالے ہوئے ورق، بعض نرم لکڑیوں کی تختیاں جن پر تحریر کندہ ہو جاتی اور جنھیں قتب کہا جاتا، ایجاد کی گئیں۔ ان فنون کی ترقی میں سب سے زیادہ دخل قرآنِ پاک کو محفوظ کرنے کی سعی کا تھا۔ اسی طرح روشنائی سازی کا فن بہت ترقی کر گیا۔

اسلامی ثقافت محض چند مفروضوں اور چند تصورات سے عبارت نہیں ہے بلکہ یہ انسانی زندگی کے ہر گوشے اور ہر عمل کے بارے میں واضح اور حقیقی رہنمائی اور ہدایت فراہم کرتی ہے۔ یہ قول و عمل میں تطبیق پیدا کر کے انسان کے علم، عقیدہ، قانون، رسوم و رواج، معاشرت، معیشت، سیاست اور فنون، غرض ان تمام اعمال کو جو انسان معاشرے کے ایک فرد کی حیثیت سے انجام دیتا ہے، آفاقی توحیدی ثقافت وتہذیب کے اخلاقی اصولوں کی روشنی میں ایک نئی شکل دیتا ہے اور انسانی معاشرے کو عدلِ اجتماعی کی بنیاد پر قائم کرتا ہے۔ اس معاشرے میں فرد کی ذاتی تربیت اور شخصیت کے ارتقا کے لیے فطری اور مناسب ماحول کی موجودگی اور ارادہ و عمل کی آزادی ایک متوازن اور صحت مند زندگی گزارنے کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔

اسلامی ثقافت قرآن اور سنت نبوی کی بنیادوں پر وجود میں آتی ہے اور اپنی ہمہ گیری کے سبب ہر زمانے اور دور کی ضروریات و مطالبات کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ عربوں کے قبل اسلام کے رسوم و رواج کا نام نہیں ہے کیوں کہ اسلام کے آنے کا مقصد عربوں کو اسلام کے ضابطے میں لانا تھا، دنیا کے انسانوں کو عربیت کا رنگ دینا نہیں تھا۔ قرآن کریم کے احسانات میں سے ایک عظیم احسان اپنے معانی کے بیان کے لیے عربی زبان کو منتخب کرنا ہے۔ اگر قرآن عربی زبان پر یہ احسان نہ کرتا تو عربی بھی عبرانی اور دیگر زبانوں کی طرح سے ایک مدفون زبان بن جاتی۔ قرآنی ثقافت زمان و مکان کی قید اور مشرق و مغرب کے رسوم و رواج سے آزاد ایک ایسے زاویہ نظر اور طرزِ حیات کا نام ہے، جس نے انسانوں کو جو اپنی تعریف ’حیوانِ ناطق‘ یا ’معاشرتی حیوان‘ سے کرتے تھے، ایک ’اخلاقی مخلوق‘ میں تبدیل کر دیا جس کا ہر ہر عمل عقل و دانش اور وحی الٰہی کے تابع ہونے کی بنا پر مقبول و محمود قرار پایا۔

●●

حرف دانش: تعریف کرنے والوں، بھلا چاہنے والوں کے ساتھ اخلاق کا مظاہرہ کرنا تو عام بات ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ ہم اپنے بدخواہوں کے ساتھ بھی بہتر سلوک کریں، جو پیٹھ پیچھے ہماری مذمت کرتے ہیں، جو اندر ہی اندر ہمارے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ اخلاق یہ ہے کہ ان کی جانب سے پیدا کی ہوئی رکاوٹوں کو نظر انداز کیا جائے، کبھی ان کی باتوں کا جواب نہ دیا جائے اور نہ ہی ان سے بدلہ لینے کا خیال دل میں لایا جائے۔

بلاشبہ ایسا کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا، اس کے لیے ہمت چاہیے، قوتِ برداشت چاہیے، ہار نہ ماننے والا جذبہ چاہیے، خود پر اور خود سے کہیں زیادہ اپنے رب تعالیٰ پر اعتماد چاہیے۔

آپ ایسا کریں گے تو کبھی کبھی آپ اپنی ہی نظر میں سب سے بڑے احمق بن جائیں گے لیکن میرے پیارے! آخرت کے دن مالک کی نگاہِ رحمت میں آپ سب سے بڑے عقل مند ثابت ہوں گے۔ ہم سے بڑے بڑے نیک اعمال تو ہوتے نہیں، گناہ البتہ بکثرت ہوتے رہتے ہیں۔

کیا یہ آپ کے حق میں اچھا نہیں ہے کہ اپنے متعلق کسی کی غیبت، کسی کی چال، کسی کے فریب اور کسی کی بدخواہی آپ کی نیکیوں میں اضافے اور گناہوں میں کمی کا ذریعہ بنتی رہے، اور ذہنی و دماغی اذیت کے احساس سے آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسوؤں کے قطرے آپ کے باطن کو دھلتے رہیں اور صبر کی یہ کیفیت آپ کو اپنے مالک کی نصرت و توفیق کا حق دار بناتی رہے؟

حضرت سید قمر الاسلام علیمی، خانقاہ ولیہ قادریہ، فتح پور، یوپی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت مدبر اور ماہر سیاست

سیاسی مہارت، حکمت عملی، منصوبہ بندی، دور اندیشی، مدبرانہ صلاحیت اور خداداد تنظیمی کمالات پر چند حروف

از: مولانا جاوید احمد

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی جس طرح بحیثیت ایک مزکیِ نفوس اور ایک معلّم اخلاق کے، ہمارے لیے اُسوہ اور نمونہ ہے، اسی طرح بحیثیت ایک ماہرِ سیاست اور ایک مدبرِ کامل کے بھی اُسوہ اور مثال ہے۔ آج کی اس صحبت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے اسی پہلو سے متعلق چند باتیں مَیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔

نئی شیرازہ بندی: اس امرِ واقعی سے آپ میں سے ہر شخص واقف ہے کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب قوم سیاسی اعتبار سے ایک نہایت پست حال قوم تھی۔ مشہور مؤرخ علّامہ ابن خلدون نے تو ان کو ان کے مزاج کے اعتبار سے بھی ایک بالکل غیر سیاسی قوم قرار دیا ہے۔ ممکن ہے ہم میں سے بعض لوگوں کو اس رائے سے پورا پورا اتفاق نہ ہو، تاہم اس حقیقت سے تو کوئی شخص بھی انکار نہیں کرسکتا کہ اہلِ عرب اسلام سے پہلے اپنی پوری تاریخ میں کبھی وحدت اور مرکزیت سے آشنا نہیں ہوئے ہیں، بلکہ ہمیشہ ان پر نراج اور انارکی کا تسلّط رہا۔ پوری قوم جنگ جو اور باہم نبرد آزما قبائل کا ایک مجموعہ تھی، جس کی ساری قوت و صلاحیت خانہ جنگیوں اور آپس کی لُوٹ مار میں برباد ہورہی تھی۔ اتحاد، تنظیم، شعور، قومیت اور حکم و اطاعت وغیرہ جیسی چیزیں، جن پر اجتماعی اور سیاسی زندگی کی بنیادیں قائم ہوتی ہیں، ان کے اندر یکسر مفقود تھیں۔ ایک خاص بدویانہ حالت پر صدیوں تک زندگی گزارتے گزارتے ان کا مزاج نراج پسندی کے لیے اتنا پختہ ہوچکا تھا کہ ان کے اندر وحدت و مرکزیت پیدا کرنا ایک امرِ محال بن چکا تھا۔ خود قرآن نے ان کو قَوۡمًا لُّدًّا کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، جس کے معنی جھگڑالو قوم کے ہیں اور ان کی وحدت و تنظیم کے بارے میں فرمایا کہ: لَوۡ اَنۡفَقۡتَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مَّاۤ اَلَّفۡتَ بَیۡنَ قُلُوۡبِهِمۡ (الانفال ۸:۶۲) ''اگر تم زمین کے سارے خزانے بھی خرچ کرڈالتے جب بھی ان کے دلوں کو آپس میں جوڑ نہیں سکتے تھے''۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۳ برس کی قلیل مدت میں اپنی تعلیم و تبلیغ سے اس قوم کے مختلف عناصر کو اس طرح جوڑ دیا کہ یہ پوری قوم ایک بنیانِ مرصوص بن گئی۔ یہ صرف متحد اور منظم ہی نہیں ہوگئی بلکہ اس کے اندر سے صدیوں کے پرورش پائے ہوئے اسبابِ نزاع و اختلاف بھی ایک ایک کرکے دُور ہوگئے۔ یہ صرف اپنے ظاہر ہی میں متحد و مربوط نہیں ہوگئی بلکہ اپنے باطنی عقائد و نظریات میں بھی ہم آہنگ اور ہم رنگ ہوگئی۔ یہ صرف خود ہی منظم نہیں ہوگئی بلکہ اس نے پوری انسانیت کو بھی اتحاد و تنظیم کا پیغام دیا اور اس کے اندر حکم اور اطاعت دونوں چیزوں کی ایسی اعلیٰ صلاحیتیں اُبھر آئیں کہ صرف استعارے کی زبان میں نہیں بلکہ واقعات کی زبان میں یہ قوم شتربانی کے مقام سے جہاں بانی کے مقام پر پہنچ گئی اور اس نے بلا استثنا دُنیا کی ساری ہی قوموں کو سیاست اور جہاں بانی کا درس دیا۔

اصلاحِ معاشرہ کی بنیاد: اس تنظیم و تالیف کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک بالکل اصولی اور انسانی تنظیم تھی۔ اس کے پیدا کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ تو قومی، نسلی، لسانی اور جغرافیائی تعصّبات سے کوئی فائدہ اُٹھایا، نہ قومی حوصلوں کی انگیخت سے کوئی کام لیا، نہ دُنیوی مفادات کا کوئی لالچ دلایا، نہ کسی دشمن کے ہوّے سے لوگوں کو ڈرایا۔ دنیا میں جتنے بھی چھوٹے یا بڑے مدبّر اور سیاست دان گزرے ہیں، انھوں نے ہمیشہ اپنے سیاسی منصوبوں کی تکمیل میں انھی محرکات سے کام لیا ہے۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان چیزوں سے فائدہ اُٹھاتے تو یہ بات آپ کی قوم کے مزاج کے بالکل مطابق ہوتی لیکن آپ نے نہ صرف یہ کہ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا، بلکہ ان میں سے ہر چیز کو ایک فتنہ قرار دیا اور ہر فتنے کی خود اپنے ہاتھوں سے بیخ کنی فرمائی۔

آپ نے اپنی قوم کو صرف خدا کی بندگی اور اطاعت، عالم گیر انسانی اخوت، ہمہ گیر عدل و انصاف، اعلائے کلمۃ اللہ اور خوفِ آخرت کے محرکات سے جگایا۔ یہ سارے محرکات نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ

تھے۔ اس وجہ سے آپ کی مساعی سے دُنیا کی قوموں میں صرف ایک قوم کا اضافہ نہیں ہوا بلکہ ایک بہترین اُمت ظہور میں آئی جس کی تعریف یہ بیان کی گئی: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (اٰلِ عمران ۳:۱۱۰) ''تم بہتر ہواُن سب اُمتوں میں جو لوگوں میں ظاہر ہوئیں، بھلائی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے منع کرتے ہو''۔

ہر قیمت پر اصولوں کی پاس داری: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور تدبّر کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آپ جن اصولوں کے داعی بن کر اُٹھے، اگرچہ وہ جیسا کہ مَیں نے عرض کیا: فرد، معاشرہ اور قوم کی ساری زندگی پر حاوی تھے، انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ہر گوشہ ان کے احاطے میں آتا تھا لیکن آپ نے اپنے کسی اصول کے معاملے میں کبھی کوئی لچک قبول نہیں کی، نہ دشمن کے مقابل میں، نہ دوست کے مقابل میں۔ آپ کو سخت سے سخت حالات سے سابقہ پیش آیا، ایسے سخت حالات سے کہ لوہا بھی ہوتا تو ان کے مقابل میں نرم پڑ جاتا لیکن آپ کی پوری زندگی گواہ ہے کہ آپ نے کسی سختی سے دب کر کسی اصول کے معاملے میں کوئی سمجھوتا گوارا نہیں فرمایا۔ اسی طرح آپ کے سامنے پیش کش بھی کی گئی اور آپ کو مختلف قسم کے دینی و دنیوی مصلحتیں بھی سمجھانے کی کوشش کی گئی لیکن اس قسم کی تدبیریں اور کوششیں بھی آپ کے کسی اصول کو بدلوانے میں کامیاب نہ ہوسکیں۔ آپ جب دنیا سے تشریف لے گئے تو اس حال میں تشریف لے گئے کہ آپ کی زبانِ مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات اپنی اپنی جگہ پر پتھر کی لکیر کی طرح ثابت و قائم تھی۔ دنیا کے مدبّروں اور سیاست دانوں میں سے کسی ایسے مدبّر اور سیاست دان کی نشان دہی آپ نہیں کر سکتے، جو اپنے دو چار اصولوں کو بھی دنیا میں برپا کرنے میں اتنا مضبوط ثابت ہوسکا ہو کہ اس کی نسبت یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ اس نے اپنے کسی اصول کے معاملے میں کمزوری نہیں دکھائی یا کوئی ٹھوکر نہیں کھائی لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک پورا نظامِ زندگی کھڑا کر دیا، جو اپنی خصوصیات کے لحاظ سے زمانے کے مذاق اور رجحان سے اتنا بے جوڑ تھا کہ وقت کے مدبرین اور ماہرینِ سیاست اس انوکھے نظام کے پیش کرنے کے سبب سے حضور کو دیوانہ کہتے تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نظامِ زندگی کو عملاً دنیا میں برپا کر کے ثابت کر دیا کہ جو لوگ انہیں کو دیوانہ سمجھتے تھے، وہ خود دیوانے تھے۔

صرف یہی نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ذاتی مفاد یا مصلحت کی خاطر اپنے کسی اصول میں کوئی ترمیم نہیں فرمائی بلکہ اپنے پیش کردہ اصولوں کے لیے بھی اپنے اصولوں کی قربانی نہیں دی۔ اصولوں کے لیے جانی اور مالی اور دوسری تمام محبوبات کی قربانی دی گئی۔ ہر طرح کے خطرات برداشت کیے گئے اور ہر طرح کے نقصانات گوارا کیے گئے لیکن اصولوں کی ہر حال میں حفاظت کی گئی۔ اگر کوئی بات صرف کسی خاص مدت تک کے لیے تھی تو اس کا معاملہ اور تھا، اس کی مدت ختم ہوجانے کے بعد وہ ختم ہوگئی یا اس کی جگہ اس سے بہتر کسی دوسری چیز نے لے لی لیکن باقی رہنے والی چیزیں ہر حال اور ہر قیمت پر باقی رکھی گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی پوری زندگی میں یہ کہنے کی نوبت کبھی نہیں آئی کہ میں نے دعوت تو دی تھی فلاں اصول کی لیکن اب حکمتِ عملی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو چھوڑ کر اس کی جگہ پر فلاں بات بالکل اس کے خلاف اختیار کر لی جائے۔

اصولی سیاست: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اس اعتبار سے بھی دُنیا کے لیے ایک نمونہ اور مثال ہے کہ آپ نے سیاست کو عبادت کی طرح ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک رکھا۔ آپ جانتے ہیں کہ سیاست میں وہ بہت سی چیزیں مباح بلکہ بعض حالات میں مستحسن سمجھی جاتی ہیں جو شخصی زندگی کے کردار میں مکروہ اور حرام قرار دی جاتی ہیں۔ کوئی شخص اگر اپنی کسی ذاتی غرض کے لیے جھوٹ بولے، چال بازیاں کرے، عہد شکنیاں کرے، لوگوں کو فریب دے یا ان کے حقوق غصب کرے تو اگرچہ اس زمانے میں اقدار اور پیمانے بہت کچھ بدل چکے ہیں، تاہم اخلاق بھی ان چیزوں کو معیوب ٹھیراتا ہے اور قانون بھی ان باتوں کو جرم قرار دیتا ہے۔ لیکن اگر ایک سیاست دان اور ایک مدبّر یہی سارے کام اپنی سیاسی زندگی میں اپنی قوم یا اپنے ملک کے لیے کرے تو یہ سارے کام اس کے فضائل و کمالات میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کی زندگی میں بھی اس کے اس طرح کے کارناموں پر اس کی تعریفیں ہوتی ہیں اور مرنے کے بعد بھی انھی کمالات کی بنا پر وہ اپنی قوم کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ سیاست کے لیے یہی اوصاف و کمالات عرب جاہلیت میں بھی ضروری سمجھے جاتے تھے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ جو لوگ ان باتوں میں شاطر ہوتے تھے وہی لوگ اُبھر کر قیادت کے

مقام پر آتے تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سیاسی زندگی سے دنیا کو یہ درس دیا کہ ایمان داری اور سچائی جس طرح انفرادی زندگی کی بنیادی اخلاقیات میں سے ہے، اسی طرح اجتماعی اور سیاسی زندگی کے لوازم میں سے بھی ہے، بلکہ آپ نے ایک عام شخص کے جھوٹ کے مقابل میں ایک صاحبِ اقتدار اور ایک بادشاہ کے جھوٹ کو کہیں زیادہ سنگین قرار دیا ہے۔ آپ کی پوری سیاسی زندگی ہمارے سامنے ہے۔ اس سیاسی زندگی میں وہ تمام مراحل آپ کو پیش آئے ہیں، جن کے پیش آنے کی ایک سیاسی زندگی میں توقع کی جاسکتی ہے۔

آپ نے ایک طویل عرصہ نہایت مظلومیت کی حالت میں گزارا اور پھر کم وبیش اتنا ہی عرصہ آپ نے اقتدار اور سلطنت کا گزارا۔ اس دوران میں آپ کو حریفوں اور حلیفوں دونوں سے مختلف قسم کے سیاسی اور تجارتی معاہدے کرنے پڑے، دشمنوں سے متعدد جنگیں کرنی پڑیں، عہد شکنی کرنے والوں کے خلاف جوابی اقدامات کرنے پڑے، قبائل کے وفود سے معاملے کرنے پڑے، آس پاس کی حکومتوں کے وفود سے سیاسی گفتگوئیں کرنی پڑیں اور سیاسی گفتگوؤں کے لیے اپنے وفود ان کے پاس بھیجنے پڑے، بعض بیرونی طاقتوں کے خلاف فوجی اقدامات کرنے پڑے۔ یہ سارے کام آپ نے انجام دیے لیکن دوست اور دشمن ہر شخص کو اس بات کا اعتراف ہے کہ آپ نے کبھی کوئی وعدہ جھوٹا نہیں کیا، اپنی کسی بات کی غلط تاویل کرنے کی کوشش نہیں فرمائی، کوئی بات کہہ چکنے کے بعد اس سے انکار نہیں کیا، کسی معاہدے کی کبھی خلاف ورزی نہیں کی۔ حلیفوں کا نازک سے نازک حالات میں بھی ساتھ دیا اور دشمنوں کے ساتھ بدتر سے بدتر حالات میں بھی انصاف کیا۔ اگر آپ دُنیا کے مدبّرین اور اہلِ سیاست کو اس کسوٹی پر جانچیں تو مَیں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو بھی آپ اس کسوٹی پر کھرا نہ پائیں گے۔ پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ سیاست میں عبادت کی سی دیانت اور سچائی قائم رکھنے کے باوجود حضور کو اپنی سیاست میں کبھی کسی ناکامی کا تجربہ نہیں کرنا پڑا۔ اب آپ اس چیز کو چاہے تدبّر کہیے یا حکمتِ نبوت۔

خوں ریزی سے پاک انقلاب: حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور تدبّر کا یہ بھی ایک اعجاز ہے کہ آپ نے عرب جیسے ملک کے ایک ایک گوشے میں امن وعدل کی حکومت قائم کردی۔ کفّار ومشرکین کا زور آپ نے اس طرح توڑ دیا کہ فتح مکہ کے موقعے پر فی الواقع انھوں نے گھٹنے ٹیک دیے، یہود کی سیاسی سازشوں کا بھی آپ نے خاتمہ کردیا، رومیوں کی سرکوبی کے لیے بھی آپ نے انتظامات فرمائے۔ یہ سارے کام آپ نے کرڈالے لیکن پھر بھی انسانی خون بہت کم بہا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی تاریخ بھی شہادت دیتی ہے اور آج کے واقعات بھی شہادت دے رہے ہیں کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں جانیں ختم ہوجاتی ہیں اور مال واسباب کی بربادی کا تو کوئی اندازہ نہیں کیا جاسکتا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے جو انقلاب برپا ہوا، اس کی عظمت اور وسعت کے باوجود شاید ان نفوس کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہوگی جو اس جدوجہد کے دوران میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں میں سے شہید ہوئے یا مخالف گروہ کے آدمیوں میں سے قتل ہوئے۔

پھر یہ بات بھی غایت درجہ اہمیت رکھتی ہے کہ دنیا کے معمولی معمولی انقلابات میں بھی ہزاروں لاکھوں آبروئیں فاتح فوجوں کی ہوس کا شکار ہوجاتی ہیں اور مفتوحہ ملک کی سڑکیں اور گلیاں حرام کی نسلوں سے بھر جاتی ہیں۔ اس تہذیب وتمدن کے عہد میں بھی اس صورتِ حال پر اربابِ سیاست شرمندگی اور ندامت کے اظہار کے بجائے اس کو ہر انقلاب کا ایک ناگزیر نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں دنیا میں جو انقلاب رُونما ہوا، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی ایک واقعہ بھی ہم کو ایسا نہیں ملتا کہ کسی نے کسی کے ناموس پر دست درازی کی ہو۔

دنیوی کرّ وفر کے بجائے فقر ودرویشی: اہلِ سیاست کے لیے طمطراق بھی سیاست کے لوازم میں سے سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگ عوام کو ایک نظام میں پرونے اور ایک نظم قاہر کے تحت منظم کرنے کے لیے اُٹھتے ہیں وہ بہت سی باتیں اپنوں اور بے گانوں پر اپنی سطوت جمانے اور اپنی ہیبت قائم کرنے کے لیے اختیار کرتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ یہ ساری باتیں ان کی سیاسی زندگی کے لازمی تقاضوں میں سے ہیں۔ اگر وہ یہ باتیں نہ اختیار کریں گے تو سیاست کے جو تقاضے ہیں وہ ان کے پورے کرنے سے قاصر رہ جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے جب وہ نکلتے ہیں تو بہت سے لوگ ان کے جلو میں چلتے ہیں، جہاں وہ

بیٹھتے ہیں ان کے نعرے بلند کرائے جاتے ہیں، جہاں وہ اُترتے ہیں ان کے جلوس نکالے جاتے ہیں، جلسوں میں ان کے حضور میں ایڈریس پیش کیے جاتے ہیں اور ان کی شان میں قصیدے پڑھے جاتے ہیں۔ جب وہ مزید ترقی کر جاتے ہیں تو ان کے لیے قصر و ایوان آراستہ کیے جاتے ہیں، ان کو سلامیاں دی جاتی ہیں، ان کے لیے بری و بحری اور ہوائی خاص سواریوں کے انتظامات کیے جاتے ہیں۔ جب وہ کبھی کسی سڑک پر نکلنے والے ہوتے ہیں تو وہ سڑک دوسروں کے لیے بند کر دی جاتی ہے۔

اُس زمانے میں ان چیزوں کے بغیر نہ کسی صاحبِ سیاست کا تصور دوسرے لوگ کرتے اور نہ کوئی صاحبِ سیاست ان لوازم سے الگ خود اپنا کوئی تصور کرتا لیکن ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس اعتبار سے بھی دُنیا کے تمام اہلِ سیاست سے الگ رہے۔ جب آپ اپنے صحابہ میں چلتے تو کوشش فرماتے کہ سب کے پیچھے چلیں، مجلس میں تشریف رکھتے تو اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا کہ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کون ہیں؟ کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے تو دوزانو ہو کر بیٹھتے اور فرماتے کہ میں اپنے رب کا غلام ہوں اور جس طرح ایک غلام کھانا کھاتا ہے، اس طرح مَیں بھی کھانا کھاتا ہوں۔ ایک مرتبہ ایک بدو اپنے اس تصور کی بنا پر جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس کے ذہن میں رہا ہوگا، سامنے آیا تو حضور کو دیکھ کر کانپ گیا۔ آپ نے اس کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ڈرو نہیں، میری ماں بھی سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی، یعنی جس طرح تم نے اپنی ماں کو بدویانہ زندگی میں سوکھا گوشت کھاتے دیکھا ہوگا، اس طرح کا سوکھا گوشت کھانے والی ایک ماں کا بیٹا مَیں بھی ہوں۔ نہ آپ کے لیے کوئی خاص سواری تھی، نہ کوئی خاص قصر و ایوان تھا، نہ کوئی خاص باڈی گارڈ تھا۔ آپ جو لباس دن میں پہنتے، اس میں شب میں استراحت فرماتے اور صبح کو وہی لباس پہنے ہوئے ملکی اور غیر ملکی وفود اور سفرا سے مسجد نبوی کے فرش پر ملاقاتیں فرماتے اور تمام اہم سیاسی اُمور کے فیصلے فرماتے۔

یہ نہ خیال فرمائیے کہ اس زمانے کی بدویانہ زندگی میں سیاست اس طمطراق اور ٹھاٹ باٹ سے آشنا نہیں ہوئی تھی، جس طمطراق اور جس ٹھاٹ باٹ کی وہ اب عادی ہوگئی ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ سیاست اور اہلِ سیاست کی تو آشا ہی ہمیشہ سے یہی رہی ہے۔ فرق اگر ہوا ہے تو محض بعض ظاہری باتوں میں ہوا ہے۔ البتہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نئے طرز کی سیاسی زندگی کا نمونہ دنیا کے سامنے رکھا، جس میں دنیوی کرّ وفر کے بجائے خلافت الٰہی کا جلال اور ظاہری ٹھاٹ باٹ کی جگہ خدمت اور محبت کا جمال تھا لیکن اس سادگی اور اس فقر و درویشی کے باوجود اس کے دبدبے اور اس کے شکوے کا یہ عالم تھا کہ روم و شام کے بادشاہوں پر اس کے تصور سے لرزہ طاری ہوتا تھا۔

اہل اور تربیت یافتہ رفقا کی تیاری: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاست اور تدبّر کا ایک اور پہلو بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ آپ نے اپنی حیاتِ مبارک ہی میں ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت بھی تربیت کر کے تیار کر دی جو آپ کے پیدا کردہ انقلاب کو اس کے اصلی مزاج کے مطابق آگے بڑھانے، اس کو مستحکم کرنے اور اجتماعی و سیاسی زندگی میں اس کے تمام مقتضیات کو بروے کار لانے کے لیے پوری طرح اہل تھے۔ چنانچہ تاریخی حقیقت سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اس انقلاب نے عرب سے نکل کر آس پاس کے دوسرے ممالک میں قدم رکھ دیا اور دیکھتے دیکھتے اس کرۂ ارض کے تین براعظموں میں اس نے اپنی جڑیں جمالیں اور اس کی اس وسعت کے باوجود اس کی قیادت کے لیے موزوں اشخاص و رجال کی کمی نہیں محسوس ہوئی۔ میں نے جن تین براعظموں کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کے متعلق یہ حقیقت بھی ہر شخص جانتا ہے کہ ان کے اندر وحشی قبائل آباد نہیں تھے بلکہ وقت کی جبار و قہار سلطنتیں نہایت ترقی یافتہ تھیں لیکن اسلامی انقلاب کی فوجوں نے جزیرۂ عرب سے اُٹھ کر ان کو ان کی جڑوں سے اس طرح اُکھاڑ پھینکا گویا زمین میں ان کی کوئی بنیاد ہی نہیں تھی اور ان کے ظلم و جَور کی جگہ ہر گوشے میں اسلامی تہذیب و تمدن کی برکتیں پھیلا دیں جن سے دنیا صدیوں تک متمتع ہوتی رہی۔

دنیا کے تمام مدبّرین اور اہلِ سیاست کی پوری فہرست پر نگاہ ڈال کر غور کیجیے کہ ان میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نظر آتا ہے جس نے اپنے دو چار ساتھی بھی ایسے بنانے میں کامیابی حاصل کی ہو جو اس کے فکر و فلسفہ اور اس کی سیاست کے ان معنوں میں عالم اور عامل رہے

ہوں، جن معنوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے عالم وعامل ہزاروں صحابہ تھے۔

نبیِ خاتم اور پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم: آخر میں ایک بات بطور تنبیہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اصلی مرتبہ اور مقام یہ ہے کہ آپ نبیِ خاتم اور پیغمبرِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سیاست اور تدبّر اس مرتبۂ بلند کا ایک ادنیٰ شعبہ ہے۔ جس طرح ایک حکمران کی زندگی پر ایک تحصیل دار کی زندگی کے زاویے سے غور کرنا ایک بالکل ناموزوں بات ہے، اس سے زیادہ ناموزوں بات شاید یہ ہے کہ ہم سیّد کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر ایک ماہرِ سیاست یا ایک مدبّر کی زندگی کی حیثیت سے غور کریں۔

نبوت ورسالت ایک عظیم عطیۂ الٰہی ہے۔ جب یہ عطیہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو بخشتا ہے تو وہ سب کچھ اس کو بخش دیتا ہے، جو اس دنیا میں بخشا جا سکتا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو صرف نبی ہی نہیں تھے بلکہ خاتم الانبیاء تھے۔ صرف رسول ہی نہیں تھے بلکہ سیّد المرسلین تھے۔ صرف اہلِ عرب ہی کے لیے نہیں بلکہ تمام عالم کے لیے مبعوث ہوئے تھے اور آپ کی تعلیم و ہدایت صرف کسی خاص مدت تک ہی کے لیے نہیں تھی بلکہ ہمیشہ باقی رہنے والی تھی۔ اور یہ بھی ہر شخص جانتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی دینِ رہبانیت کے داعی بن کر نہیں آئے بلکہ ایک ایسے دین کے داعی تھے جو روح اور جسم دونوں پر حاوی اور دنیا و آخرت دونوں کی حسنات کا ضامن تھا، جس میں عبادت کے ساتھ سیاست اور درویشی کے ساتھ حکمرانی کا جوڑ محض اتفاق سے نہیں پیدا ہو گیا تھا بلکہ یہ عین اس کی فطرت کا تقاضا تھا۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑا سیاست دان اور مدبّر اور کون ہو سکتا ہے لیکن یہ چیز آپ کا اصلی کمال نہیں بلکہ جیسا کہ مَیں نے عرض کیا، آپ کے فضائل و کمالات کا محض ایک ادنیٰ شعبہ ہے۔

●●

(بقیہ ص ۷۳ کا) (۳) أَنَّ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: "مَامِنْ مُصِيبَةٍ تُصِيبُ الْمُسْلِمَ إِلَّا كَفَّرَ اللهُ بِهَا عَنْهُ، حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا" (صحیح البخاری باب ماجاء فی کفارۃ المرض)

ترجمہ: حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ آقائے کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مومن کو جب بھی کوئی تکلیف پہنچتی ہے یہاں تک کہ اگر اس کو کانٹا چبھے تو اس کے عوض رب اس کے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

آج معاشرے پر ہر طرف کالی گھٹا چھائی ہوئی ہے، ہر طرف فتنہ وفساد برپا ہے، کوئی علاقہ، کوئی شہر، کوئی بستی، کوئی کوچہ، کوئی قبیلہ، کوئی خاندان، کوئی گھر اور نہ ہی کوئی جماعت ایسی ہے جس میں لڑائی جھگڑا نہ ہو۔ حتی کہ ماں باپ، بیٹا بیٹی، بھائی بہن، بیوی اور شوہر، استاد اور شاگرد، مالک اور نوکر، سینئر اور جونیئر ایک دوسرے سے دست وگریباں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی بڑی لڑائیاں بن جاتی ہیں، ذرا سی بات پر پوری زندگی کے لیے بغض وعداوت اور غیض وغضب سے سینے بھر جاتے ہیں۔ بات اتنی ہوتی نہیں اور معاملات بگاڑ بگاڑ کر کہاں سے کہاں پہنچا دیے جاتے ہیں، کسی نے کچھ کہہ دیا۔ بس آستین چڑھا لیے، چہرہ غصے سے لال پیلا ہو گیا، جو منھ میں آ رہا ہے بول رہا ہے، طلاق، طلاق، طلاق نکل جاؤ میرے گھر سے واپس مڑ کر بھی نہیں دیکھنا۔ اس کو میرے جنازہ میں شریک نہیں ہونے دینا۔

غرض کون کون سا جملہ نقل کروں، ایک بول پر ساری زندگی کا رشتہ ختم اور ساری زندگی کے لیے ناطہ توڑ دیا جاتا ہے، افسوس صد افسوس، خونی رشتوں کو بھی نہیں دیکھا جاتا، ان سب باتوں کی اصل وجہ حد سے بڑھ کر کسی پر اعتماد کرنا ہے اور اس سے ایسی ایسی توقعات رکھنا کہ اس کو انسانوں کی فہرست سے نکال کر فرشتوں کی قطار میں داخل کر دینا ہے، جب وہ توقعات پر نہیں اترتا اور اعتماد کو ٹھیس پہنچا دیتا ہے تو ہم آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں لڑائی جھگڑوں سے دور رہنے کے لیے صبر کا دامن تھامنا چاہیے اور جلد بازی اور بے صبری سے کام نہیں لینا چاہیے۔

آج ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ہمہ وقت صبر کی سواری پر سوار رہیں، مصائب، تکالیف، پریشانیاں اور غم آتے رہیں گے مگر ہر موقع پر ہمارا درماں صبر ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر حال میں صبر کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ النبی الکریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم

●●

تذکیر وتذکیہ

41

دعا کی جلد قبولیت کے تین نسخے

دعا قبول نہ ہونے کا شکوہ کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اللہ پاک کب، کیسے اور کس کی دعا قبول کرتا ہے

از: عادل سہیل ظفر

اللہ تعالیٰ نے اِرشاد فرمایا:

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (سُورۃ البقرہ: آیت نمبر ۱۸۶)

ترجمہ: اور اے محبوب! جب تم سے میرے بندے مجھے پوچھیں تو میں نزدیک ہوں، دعا قبول کرتا ہوں پکارنے والے کی جب مجھے پکارے۔ تو انہیں چاہیے میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں کہ کہیں راہ پائیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا یہ فرمان مُبارک اِس بات کی دلیل ہے کہ اللہ ہم سے بالکل قریب ہے اور ہماری دُعائیں سُنتا ہے اور قُبول فرماتا ہے۔ پس لوگوں کا یہ کہنا اور سمجھنا کہ اللہ تو ہماری سُنتا نہیں، یا فُلاں لوگوں کی سنتا ہے اور فُلاں لوگوں کی نہیں سنتا، فُلاں کی مانتا ہے، اور فُلاں کی نہیں مانتا، ہماری سنتا نہیں اور فُلاں کی ٹالتا نہیں، اِس قسم کے سب ہی عقائد اور خیالات اللہ تبارک وتعالیٰ کے اِس فرمان مُبارک کا بھی اِنکار ہیں، یعنی دوسرے اَلفاظ میں یہ کہا جائے گا کہ ایسے عقائد یا خیالات اللہ تبارک وتعالیٰ کے مذکورہ بالا فرمان کا کفر ہیں۔ اِس کفریہ عقیدے اور خیال کا شِکار کرنے کے بعد شیطان مردود اور اُس کے پیروکار، اللہ کے بندوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ سے دُعا کرنے میں گمراہی کی راہوں پر گامزن کر دیتے ہیں۔

یہ بھی یاد رکھیے اور ہمیشہ یاد رکھیے کہ کوئی بھی بات پہلے سُنی جاتی ہے اور پھر قبول یا رَد کی جاتی ہے، اور ہمارے ربّ نے ہمیں یہ یقین دہانی کروائی ہے کہ وہ دُعائیں قبول کرتا ہے لہٰذا دُعائیں سُنا جانا تو قبول کیے جانے سے زیادہ یقینی امر ہوا، لہٰذا ہمیں اللہ جلّ جلالہ کی طرف سے یہ مذکورہ بالا خوش خبری والا اعلان سننے، پڑھنے کے بعد نہ صِرف ایسے کفریہ عقائد اور خیالات سے توبہ کرتے ہوئے اُنہیں ترک کرنا چاہیے بلکہ یہ بھی سوچنا بلکہ سمجھنا چاہیے کہ جب خود اللہ تعالیٰ نے ہی ہمیں بتا دِیا کہ

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ

یعنی جب کوئی مجھے پکارتا ہے (دُعا یا سوال کرتا ہے) تو میں دُعا کرنے والے کی دُعا قبول کرتا ہوں۔

تو پھر ہمیں کسی شک کے بغیر، کسی دھوکے اور کسی فلسفے کے بغیر مان لینا چاہیے اور اِس پر ایمان رکھنا چاہیے کہ اللہ پاک ہماری دعائیں قبول فرماتا ہے، پس ہمیں اِس فرمان مُبارک پر مکمل ایمان رکھنا چاہیے۔ اگر ہمیں ہماری دُعائیں قبول ہوتی ہوئی محسوس نہیں ہوتیں تو ہمیں اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول کریم محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کے فرامین مُبارکہ کے مُطابق ہی اِس معاملے کو سمجھنا چاہیے، نہ کہ اُن کے فرامین مُبارکہ کے خلاف۔

ہماری زیر مطالعہ آیت مُبارکہ میں بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہمیں ایک ایسا نُسخہ بتایا گیا ہے جس پر عمل کرنے سے ہماری دُعائیں جلد قبول ہوسکتی ہیں، جی ہاں! اِسی آیت مُبارکہ میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں یہ حکم فرمایا ہے کہ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي لہٰذا (سب ہی) لوگ میری بات قبول کریں۔ یہ ہے وہ نُسخہ ہے جس پر عمل کرنے سے ہماری دُعائیں اِن شاء اللہ جلدی ہی قبول ہونے والی دُعاؤں میں شامل ہوسکتی ہیں، لیکن اِس کے لیے ہمیں یہ جاننا ہوگا کہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ نے اِس حکم پر عمل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی بات کیسے قبول کریں؟

اللہ جلّ وعلا کے اِس فرمان مُبارک میں تدبر کرنے سے ہمیں یہ سمجھ آتا ہے کہ دُعاؤں کی جلدی قبولیت کے لیے ہمیں اللہ تعالیٰ کی ساری ہی باتیں قبول کرنا ہوں گی، ہر وہ کام جِس کی طرف اللہ تعالیٰ نے بلایا، وہ کام کرنا ہوگا، اور ہر وہ کام جو کام کرنے سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادِیا اُس کام سے باز رہنا ہی ہوگا، اِسی طرح اور صرف اِس ہی طرح فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي کے حکم پر عمل ہوگا، اور جب اِس نُسخے پر عمل ہوگا تو پھر اللہ تعالیٰ بھی ہماری دعائیں اُسی وقت قبول فرمالے گا۔ اب اگر ہم اِس نُسخے کی تفصیل میں تدبر کریں تو ہمیں اِسی نُسخے کے ضمن میں اور بھی بہت سے ایسے نُسخے دِکھائی دیتے ہیں جن کو اِستعمال کرتے

ہوئے ہم اِس بنیادی نُسخے کے فائدے حاصل کر سکتے ہیں، اور اپنی دُعاؤں کو اللہ کے یہاں جلد ہی قبول ہونے والی دُعاؤں میں شامل کرنے کی بھرپور کوشش کر سکتے ہیں لہٰذا ہمیں خُوب اچھی طرح اُن باتوں اور کاموں کے بارے میں جان لینا چاہیے جِن کی طرف ہمیں اللہ تعالیٰ نے بلایا ہے، تا کہ ہم ان کو قبول کریں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں ہماری دعائیں فوراً قبول ہوا کریں۔

پہلا نُسخہ: نیکی کے کام کرنے میں جلدی کرنا:

دُعا کے فورا قبول ہونے کا سب سے پہلا ذریعہ نیکی کے کام کرنے میں جلدی کرنا ہے۔ اللہ عزّوجلّ نے حضرت زکریا علیہ السلام کا واقعہ بیان فرماتے ہوئے، اپنے نیک بندوں کی صِفات میں یہ صِفات بیان فرمائی ہیں:

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَىٰ وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ (سُورۃ الانبیاء: آیت نمبر ۹۰)

ترجمہ: تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور اسے یحییٰ عطا فرمایا اور اس کے لیے اس کی بی بی سنواری۔ بے شک وہ بھلے کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہمیں پکارتے تھے امید اور خوف سے اور ہمارے حضور گڑگڑاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان مُبارک سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اللہ کے وہ نیک بندے جو نیکی کرنے میں کوئی دیر نہیں کرتے، کِسی کا اِنتظار نہیں کرتے کہ کوئی اُنہیں کِسی نیکی کی دعوت دے، نیکی کے کِسی کام کی طرف بلائے تو پھر وہ لوگ نیکی کریں، بلکہ خود نیکی کرنے کے مواقع تلاش کرتے ہیں، اپنے ہر کام کو اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں اور اُنھیں نیکی بنا لیتے ہیں، اور ایسا کرنے میں نہ صِرف دیر نہیں کرتے بلکہ بہت ہی تیزی سے نیکی کرنے کے مواقع تلاش کرتے ہیں اور نیکی والے کام کر گزرتے ہیں، اور پھر صِرف اپنے اللہ ہی کو پکارتے ہیں، صِرف اُسی سے ہی دُعائیں کرتے ہیں، اور اِس طرح کرتے ہیں کہ اُن کے دِلوں میں اللہ کے یہاں دُعاؤں کی قبولیت کا شوق ویقین بھی ہوتا ہے اور اِس بات سے بھی ڈرتے ہیں کہ کہیں اُن کی دُعا اور دُعا کرنے کے انداز واطوار میں کچھ ایسا نہ ہو جائے جِس کی وجہ سے اللہ ناراض ہو جائے اور وہ لوگ اللہ کے عذاب پانے والوں میں سے ہو جائیں لہٰذا یہ لوگ اللہ سے ڈرنے والے ہوتے ہیں، اپنے ایسے بندوں کی دعائیں بھی اللہ تعالیٰ جلدی ہی قُبول فرماتا ہے۔

اب ہم اپنا حال تو دیکھیں، ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جنہیں اللہ نے مال دیا ہے لیکن وہ کبھی یہ کوشش نہیں کرتے کہ اپنا مال خود کِسی ضرورت مند، غریب، محتاج، مسکین، بیوہ، یتیم تک پہنچا دیں بلکہ جب تک اُن کے پاس کوئی حاجت مند خود نہیں آتا اُنہیں اِس کی پرواہ ہی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مال میں سے اللہ کی راہ میں بھی خرچ کر لیں اور پھر اُن میں سے بھی کتنے ایسے ہیں جن تک جب کوئی حاجت مند پہنچتا ہے تو وہ اُس کی کوئی مدد نہیں کرتے۔ ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جِن کے پاس صحت اور وقت اُن کی ضرورت سے زیادہ میسر ہیں لیکن وہ کبھی اُن نعمتوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اگر کبھی اللہ ہی اُنہیں کوئی ایسا موقع عطا کر دے جِس سے فائدہ اُٹھا کر وہ لوگ اپنا وقت اور صحت اللہ کی راہ میں خرچ کر سکیں تو بھی وہ لوگ ایسا نہیں کرتے۔

ہم میں ہر ایک خود سے یہ پوچھے کہ

میں نے کتنی دفعہ خود کِسی محتاج اور ضرورت مند کو تلاش کر کے مالی یا بدنی طور پر اُس کی خدمت کرتے ہوئے اُس کی حاجت روائی کی ہے؟

کتنی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ میں نے کِسی کو راہ راست سے ہٹا ہوا پایا ہو اور اسے ٹھیک راستے کی خبر کی ہو؟

کتنی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ میں نے کِسی کو نماز نہ پڑھتے ہوئے دیکھ کر نماز پڑھنے کی تلقین کی ہو؟

کتنی دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے کِسی کو بے پردگی والا انداز اپنائے ہوئے دیکھ کر اُسے پردہ کے احکام پر عمل کی دعوت دِی ہو؟

کتنی دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے کِسی کو شیاطین کی آوازیں یعنی گانا اور موسیقی وغیرہ سُنتے دیکھ کر اُس سے دُور رہنے کی تلقین کی ہو؟

بلکہ کِسی اور کے ساتھ کی جانے والی نیکیوں سے پہلے خود اپنی ہی جان کے ساتھ نیکی کرنے کے بارے میں ہی سوچتے ہیں کہ کتنی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ میں نے اپنی مُعاشی اور مُعاشرتی ذمہ داریاں پوری کرنے کی دُنیاوی مشغولیات کے عِلاوہ غیر ضروری مشغولیات کو ترک کر کے خود کو اللہ کی کتاب کی تِلاوت، درست فہم اور اُس پر عمل میں مشغول کیا ہو؟

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ وسلم کی سُنّت مُبارکہ کی تعلیم اور اُس پر عمل کی طرف خود کو راغب کیا ہو؟

جب ہم اور ہمارے دُوسرے مُسلمان بھائی اور بہنیں اللہ کی

طرف بڑھیں گے ہی نہیں، نیک کام کرنے میں جلدی کرنا تو دُور ٹھہرا، نیک کاموں سے ہی دُور رہیں گے تو پھر یہ شکوہ کیوں کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں؟ جب کہ ہمارے اللہ نے، جس سے ہم دُعائیں کرتے ہیں، اور جو کسی واسطے، کسی وسیلے کے بغیر براہ راست ہماری دعائیں سنتا اور قُبول کرتا ہے، اس نے ہمیں یہ نُسخہ بتا دیا ہے کہ اُس سے دُعا قُبول کروانے کے لیے نیکی کرنے میں بہت ہی جلدی کرنا اپنا معمول بنانا پڑے گا۔

دُوسرا نُسخہ: قُبولیت کے شوق اور لگن، اور اللہ کی ناراضگی اور اُس کے عذاب کے خوف کی کیفیات کی موجودگی کے ساتھ دُعا کرنا

ارشاد ربانی ہے: وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا

مطلب یہ کہ میرے بندے مجھ سے (قُبولیت کے) شوق اور لگن اور میرے ڈر کی کیفیات میں رہتے ہوئے دُعا کرتے ہیں۔

اللہ سُبحانہ وتعالیٰ نے اِس مذکورہ بالا فرمان پاک میں یہ بھی بتا دیا کہ اُس کے یہاں دُعا کی جلدی قُبولیت کے لیے دُعا کرتے ہوئے مذکورہ بالا دو کیفیات، یعنی اللہ سے قُبولیت کا شوق اور لگن، اور اُس کی ناراضگی اور عذاب کا ڈر، کا حاضر ہونا ضروری ہے لہٰذا ضروری ٹھہرا کہ ہم اِن مذکورہ بالا دو کیفیات کو حاضر رکھتے ہوئے دُعائیں کریں۔

یہاں ایک بہت ہی اہم سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کیا جب ہم اللہ سے کوئی دُعا کرتے ہیں تو اُس وقت ہمارے دِل اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ہمارا مطمع قلب اللہ کی رضا کا حصول ہوتا ہے یا ہمارے دِل ہماری مطلوبہ چیز یا ضرورت کی طرف لگے ہوتے ہیں اور اُنہی کے حصول کے شوق اور لگن میں تڑپ رہے ہوتے ہیں؟

اِس سوال کا جواب، دُعا کی قُبولیت کے رازوں میں سے ایک راز ہے، جو دُعا کرنے والا ہر ایک شخص اپنی دُعا کے بارے میں خود ہی جان سکتا ہے۔ خُوب اچھی طرح سے یاد رکھیے کہ جو دِل اللہ کی طرف متوجہ نہ ہو اُس دِل کی دُعا اللہ کے یہاں قُبول نہیں ہوتی۔ اِس کی خبر ہمیں اُس صادق المصدوق صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم نے دِی ہے جن کے بارے میں اللہ نے گواہی دی ہے کہ وہ اپنی مرضی سے کلام نہیں فرماتے تھے بلکہ اُن کی طرف کی گئی وحی کے مُطابق کلام فرماتے تھے۔ اُنہوں نے ہمیں یہ بتایا ہے:

ادْعُوا اللهَ وَأَنْتُمْ مُوقِنُونَ بِالإِجَابَةِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللهَ لاَ يَسْتَجِيبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لاَهٍ

ترجمہ: اللہ سے اِس طرح دُعا کیا کرو کہ تُمہیں قُبول ہونے کا یقین ہو، اور جان رکھو کہ اللہ غفلت زدہ غیر متوجہ دل کی دُعا قُبول نہیں کرتا۔ (سُنن الترمذی: حدیث نمبر ۳۸۱۶، کتاب الدعوات)

پس یاد رکھیے کہ اگر دُعا کرتے ہوئے دُعا کرنے والا دِل اللہ کی طرف متوجہ نہیں تو اللہ اُس کی دُعا قُبول نہیں کرتا اور اس کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجیے کہ دِل کی حاضری سے پہلے اُس دِل میں دُعا کی قُبولیت کا یقین بھی ہونا چاہیے اور دُعا کی قُبولیت کا یقین اُسی وقت کیا جا سکتا ہے جب دُعا اور اس کے کرنے کے انداز واطوار کے بارے میں یہ یقین ہو کہ اُن میں سے کہیں بھی کچھ بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کی نافرمانی والا نہیں ہے۔

تیسرا نُسخہ: اللہ تبارک وتعالیٰ سے ڈر

قرآن پاک میں ہے: وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ

یعنی ہم سے ڈرتے تھے۔

اللہ سُبحانہ وتعالیٰ نے ہم پر اپنی بے پناہ رحمت اور شفقت کے ساتھ ہمیں یہ بھی بتا دِیا کہ اُس کے یہاں دُعا کی قُبولیت کے لیے دُعا کرنے والے کے دِل میں اللہ تعالیٰ کا ڈر ہونا بھی ایک لازمی امر ہے، کہ جس قدر دُعا کرنے والا اللہ سے ڈرنے والا ہوگا، اُسی قدر اُس کی دُعائیں اللہ کے مقبول ہونے والی ہوں گی۔

خیال رہے کہ اللہ سے ڈر صرف دُعا کرتے ہوئے ہی مطلوب نہیں، اور نہ ہی صرف دُعا کرتے ہوئے پایا جانے والا ڈر دُعا کی قُبولیت کے اسباب میں سے ہے بلکہ یہ ڈر مُسلمان کی زندگی کے ہر لمحے میں پایا جانا مطلوب ہے، اور اِس کا ہر کام اِس ڈر کے احساس کے ساتھ کیا جانا مقصود ہے، جب تک ایسا نہیں ہوگا کسی کا کوئی بھی عمل اللہ کے یہاں قُبولیت کے امکانات پانے والا نہیں ہوگا کیونکہ اللہ کے ڈر کی عدم موجودگی میں نہ تو کسی کو اللہ کی عِبادت کرنے یا نہ کرنے کا غم ہوگا، اور نہ ہی عِبادت کرنے والے کو ٹھیک طور پر عِبادت کرنے کی فکر ہوگی، اور نہ ہی مُعاشرتی زندگی میں اللہ کے بندوں کی جان، مال، اور عزتوں کو محفوظ رکھنے کی پرواہ ہوگی، اور نہ ہی اپنے رزق کو حلال ذرائع سے کمانے کی فکر ہوگی۔ پس جو شخص اللہ کی عِبادت ہی ٹھیک طور پر نہ کرتا ہو، اللہ اور اُس کے رسول کریم محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کی طرف سے مقرر کردہ حُدود سے نکل کر اپنی مرضی کے مُطابق عِبادتیں کرے، اور ان کے بتائے ہوئے انداز وطریقوں

کے بجائے اپنے یا دُوسروں کے خود ہی بنائے ہوئے طور طریقوں پر عِبادتیں کرے تو کیا اُس کی کی ہوئی عِبادتوں کو اللہ کے ڈر کے ساتھ کی جانے والی عبادات کہا یا سمجھا جا سکتا ہے؟ کیا اللہ اُس سے راضی ہوگا؟ یقیناً نہیں ہوگا تو پھر کیا اُس کی دُعائیں اللہ کی یہاں قُبول ہوں گی؟ جو شخص اللہ کے بندوں اور بالخصوص مُسلمانوں کے جان، مال اور عزت میں بغیر حق کے تصرف کرتا ہو، اُن کے حقوق کی ادائیگی میں جان بوجھ کر بد دیانتی کرتا ہو، کیا اُسے اللہ سے ڈرنے والا کہا یا سمجھا جا سکتا ہے؟ جو شخص اپنی کمائی میں حلال وحرام کی کچھ تمیز نہ رکھتا ہو، بس جیسے بھی ہو کمانے کی دُھن میں ہی لگا رہے، کیا اُسے اللہ سے ڈرنے والا کہا یا سمجھا جا سکتا ہے؟ جی نہیں! ایسے لوگوں کو اللہ سے ڈرنے والا نہیں سمجھا جا سکتا، اگر اللہ اُن کے سوال کے مُطابق کچھ دے دیتا ہے تو وہ اللہ طرف سے اُن کے لیے امتحان ہوتا ہے، اور اُن لوگوں کو اُن کی راہوں پر چھوڑ دیے جانے کے لیے ہوتا ہے۔ پس ہم سب کو بھرپور کوشش کرتے رہنا چاہیے کہ ہمارا کوئی ایک بھی، نہ ہی ظاہری اور نہ ہی باطنی قول اور فعل اللہ کے ڈر سے خالی نہ ہو۔

اپنی دُعاؤں کی قُبولیت کے لیے قرآن کریم میں بیان فرمائے گئے مذکورہ بالا تین نُسخوں پر عمل شروع کر دیجیے اور یہ بھی یاد رکھیے کہ اگر آپ کی طرف سے دُعا کی قُبولیت کی شرائط پوری ہونے کے بعد بھی دُعا کرتے کرتے اگر کافی وقت بھی گذر جائے اور بظاہر دُعا قُبول ہوتی ہوئی محسوس نہ ہو تو بھی قُبولیت سے مایوس نہیں ہونا۔ اللہ تعالیٰ کے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کی پاکیزہ اور معصوم زبان سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ خبر کروائی ہے: يُسْتَجَابُ لأَحَدِكُمْ مَالَمْ يَعْجَلْ يَقُولُ دَعَوْتُ فَلَمْ يُسْتَجَبْ لِي

ترجمہ: تُم میں سے کِسی دُعا کرنے والے کی دُعا اُس وقت قُبول ہوتی ہے جب وہ جلد بازی نہیں کرتا اور ایسا نہیں کہتا (یا ایسا نہیں سمجھنے لگتا) کہ میں نے دُعا کی اور میری دُعا قُبول نہیں کی گئی۔

(صحیح البخاری: حدیث نمبر ۶۳۴۰، کتاب الدعوات)

اور اِرشاد فرمایا: لاَ يَزَالُ يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيعَةِ رَحِمٍ مَالَمْ يَسْتَعْجِلْ

ترجمہ: بندے کی دُعا اُس وقت تک قُبول ہوتی رہتی ہے جب تک کہ وہ گناہ یا صلہ رحمی کے خلاف دُعا نہ کرے، اور جب تک وہ جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے عرض کیا، جلد بازی کرنا کیا ہے؟ اے اللہ کے رسول، تو ارشاد فرمایا:

يَقُولُ قَدْ دَعَوْتُ وَقَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ أَرَ يَسْتَجِيبُ لِي فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذَلِكَ وَيَدَعُ الدُّعَاءَ

(جلد بازی) یہ کہنے لگے کہ میں نے دُعا کی، اور دُعا کی لیکن مجھے (اپنی دُعا کی) قُبولیت ہوتی ہوئی دِکھائی نہیں دیتی، پس پھر وہ حسرت کا شِکار ہو جاتا ہے اور دُعا کرنا چھوڑ دیتا ہے۔

(صحیح مُسلم: حدیث نمبر ۷۱۱۲، کتاب الذِکر والدُعاء والتوبہ)

لہٰذا اس بات پر بھی ایمان رکھیے کہ آپ کی درست طور طریقے سے مانگی ہوئی جائز دُعا قُبول ضرور ہوگی، خواہ اُس کی قُبولیت نظر آنے میں کتنی ہی دیر کیوں نہ لگ رہی ہو، پس دُعا کرنے سے رُکیے نہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رکھیے کہ اگر درست طور طریقے پر کی ہوئی کوئی نیک دُعا دُنیا میں قُبول شدہ نظر نہ بھی آئے تو بھی اِن شاء اللہ وہ آپ کے لیے آخرت میں محفوظ کر لی گئی ہوگی۔ اس کی خبر بھی ہمیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کریم محمد صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کی زبان مُبارک سے کروائی ہے۔ فرمایا:

ما مِنْ مُسلم يَدْعُو بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيهَا إِثْمٌ وَلاَ قَطِيعَةُ رَحِمٍ إِلاَّ أَعْطَاهُ اللَّهُ بِهَا إِحْدَى ثَلاَثٍ إِمَّا أَنْ تُعَجَّلَ لَهُ دَعْوَتُهُ وَإِمَّا أَنْ يَدَّخِرَهَا لَهُ فِي الآخِرَةِ وَإِمَّا أَنْ يَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوءِ مِثْلَهَا

ترجمہ: کوئی بھی مُسلمان جب کوئی ایسی دُعا کرتا ہے جس میں گناہ نہ ہو، اور نہ ہی صلہ رحمی کے خلاف ہو، تو اللہ اُس کو (اُس کی دُعا کی قُبولیت میں) تین میں سے کوئی ایک چیز عطا کرتا ہے۔

(1) یا تو اُس کی دُعا کو جلد ہی پورا کر دیتا ہے۔

(2) یا اُس کی دُعا کو اُس کی آخرت کے لیے محفوظ کر دیتا ہے۔

(3) یا اُس کی اُس دُعا کے بدلے اُس پر آنے والے کوئی پریشانی ٹال دیتا ہے۔ (مُسند احمد: حدیث نمبر ۱۱۴۳۲)

پس میرے محترم بھائیو اور بہنو! ہم سب کو ہی چاہیے کہ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرامین، اور اللہ کی وحی کے مُطابق اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وعلی آلہ وسلم کے فرامین کے مُطابق اپنی دُعاؤں کی قُبولیت کے ان نُسخوں پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دُعا کیا کریں اور دُعا کے نتائج سے بھی مایوس نہ ہوا کریں۔

شرعی احکام ومسائل

از: مفتی محمد نظام الدین رضوی

یزید کا ظلم

صورت مسئلہ:

حضور! کسی نے سوال کیا کہ صحابۂ کرام کے پاکیزہ دور میں یزید جیسے پاپی اور بدکار نے ظلم ڈھایا، مکہ اور مدینہ کو نقصان پہنچایا، اس میں کیا حکمت ہے؟

المستفتی: محمد طارق عطاری (بذریعہ ای میل)

حکم شرعی:

عہد رسالت وعہد صحابہ وتابعین کو جو خیر القرون کہا جاتا ہے وہ اکثر کے لحاظ سے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تینوں زمانوں میں اکثر لوگ تقویٰ شعار، پرہیزگار، خداترس اور سنت نبوی کے پیروکار تھے اور یہ ان کے منافی نہیں کہ کچھ لوگ ظالم وجفا کار اور جاہل وبدکار ہوں۔ حدیث پاک میں یہ آیا ہے: **خیر القرون قرنی، ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم**، سب سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر اس کے بعد والوں کا پھر اس کے بعد والوں کا۔ اس میں یا دوسری روایات میں کہیں یہ نہیں کہ ان زمانوں میں کچھ لوگ ظالم وبدکار اور جاہل وجفا کار نہ ہوں گے۔ چوں کہ ان زمانوں کے اکثر لوگ صالحین اور سنت نبوی کے متبعین اور اخلاق حسنہ کے پیکر تھے، اس لحاظ سے ان زمانوں کو خیر القرون اور بہتر زمانہ کہا گیا۔ قرآن حکیم میں ہے: كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔ تم لوگ سب سے بہتر امت ہو، لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہو۔ (القرآن الحکیم) تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ امت کا ہر ہر فرد بھلائی کا حکم دیتا اور برائی سے روکتا ہے اور وہ ساری امتوں سے افضل ہے۔ ایسا نہیں بلکہ مجموعی طور پر امت افضل قرار پاتی ہے اور اس کے بعض برے بلکہ بہت برے ہو سکتے ہیں۔

یزید نے جو مظالم ڈھائے اور اس سے پہلے فرقہ خوارج نے جو ظلم وستم کیے اور اس سے بھی پہلے بلوائیوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کیا، یہ سارے واقعات دراصل ان لوگوں کے لیے تازیانہ عبرت ہیں جو خیر القرون کے حوادث اور نو پید اُمور کو شریعت اور اس کے بعد کے نو پید اامور کو بدعت وضلالت کہتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ بلوائیوں، خوارج اور یزید ویزیدیوں کے سیاہ کارناموں کو شریعت کہیں کہ خیر القرون میں ہوئے اور صحیح بخاری وصحیح مسلم اور دوسری کتب حدیث کی جمع وتدوین اور قیام مدارس دینیہ وغیرہ کو بدعت وضلالت کہیں کہ یہ خیر القرون کے بعد وجود میں آئے۔ اللہ انہیں سمجھ دے۔ اہل سنت وجماعت کے زمانے کو حاکم نہیں مانتے بلکہ نو پید اامر یا فعل کے حسن وقبح کی بنیاد پر اسے شریعت یا بدعت وضلالت کہتے ہیں۔ یہاں سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ خیر القرون میں یزید جیسے ظالم وجفا کار کیسے رونما ہوئے۔ العیاذ باللہ، واللہ تعالیٰ اعلم۔

شراب کے کاروبار کی رقم مسجد میں دینا

صورت مسئلہ:

زید شراب کے بڑے کاروبار کی سرپرستی کرتا ہے اور ہر ممکن مدد بھی کرتا رہتا ہے لیکن زید کے پاس اس کے علاوہ، اور بھی ذریعہ معاش وکسب موجود ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا زید کی دی ہوئی رقم مسجد یا مدرسے میں قبول کی جاسکتی ہے یا نہیں، اور کیا زید کو مسجد یا مدرسے کے جملہ عہدوں جیسے ممبر، صدر، خزانچی، متولی وغیرہ پر مقرر کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ شریعت مطہرہ کی روشنی میں رہنمائی فرما کر عند اللہ موجب اجر وثواب ہوں۔

المستفتی: محمود احمد، دوکڑا، مہولی، ضلع سنت کبیر نگر

حکم شرعی:

(۱) جب زید کے پاس حلال ذریعہ کسب بھی موجود ہے تو مسجد ومدرسے کے لیے اس کا چندہ قبول کرنا جائز ہے، کوئی حرج نہیں، وہ مدرسہ ومسجد کا جو کچھ تعاون کرے، قبول کریں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

(۲) شراب کے کاروبار میں مدد کرنا حرام وگناہ ہے، اس کے باعث زید فاسق ہے اور اس لائق نہیں کہ اسے مسجد یا مدرسے کی کمیٹی کا رکن، صدر، خازن، متولی بنائیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

بینک کے انٹرسٹ کی رقم مسجد میں دینا

صورت مسئلہ:

زید نے اپنی زمین فروخت کر دی اور اس کی تمام رقم بینک میں جمع کر دی۔ اب اس رقم کے عوض بینک سے جو سود ملتا ہے وہی زید کی کل آمدنی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ معاش زید کے پاس نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا زید کی رقم مسجد یا مدرسے میں لی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور کیا زید کو مسجد یا مدرسے کے کسی بھی عہدے پر فائز کیا جا سکتا ہے؟ مثلاً ممبر، صدر، خزانچی، وغیرہ۔ شریعت مطہرہ کی روشنی میں رہنمائی فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

المستفتی: محمود احمد، دوکڑا، مہولی، ضلع سنت کبیر نگر

حکم شرعی:

حکومت ہند کے بینکوں میں روپے جمع کرنے پر جو زائد رقم ملتی ہے وہ شرعی نقطہ نظر سے سود نہیں، بلکہ ایک مال مباح ہے جو حکومت کے مقررہ دستور کے تحت ہر کھاتے دار کو ملتا ہے، پھر یہاں کا ایک شہری ہونے کی حیثیت سے ہمارا حق بھی ہے لہٰذا حکومت کے بینکوں میں روپے جمع کر کے زائد رقم لینا جائز ہے اور اسے استعمال میں لانا بھی جائز ہے۔ دینی کاموں میں بھی اسے صرف کر سکتے ہیں، ہاں مسلم فقرا و حاجت مندوں کو دینا افضل ہے۔ زید اگر پابند شرع، امانت دار اور انتظامی اُمور میں مشورہ دینے اور مفوضہ ذمے داریوں کو سنبھالنے کا اہل ہے تو حسب لیاقت اسے مسجد یا مدرسے کی انتظامیہ کا رکن، خازن، صدر، متولی بنا سکتے ہیں، اور وہ مسجد یا مدرسے کو جو چندہ دے، اسے لے سکتے ہیں، بلکہ لینا ہی چاہیے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

دلہن کو دیے گئے زیورات کا حکم

صورت مسئلہ:

ہمارے یہاں یہ عرف ہے کہ دلہن کو جو زیور دیے جاتے ہیں، صرف پہننے کے لیے دیے جاتے ہیں، دلہن کو اس کا مالک نہیں بناتے اس لیے جب طلاق ہوتی ہے تو وہ زیور لے لیتے ہیں لیکن باپ اپنے بیٹے سے کبھی اس کا مطالبہ نہیں کرتا گویا اس کو مالک بنا دیتا ہے۔

اسی طرح زید نے بھی اپنے بیٹے کی شادی کے موقع پر اس کی دلہن کو زیور دیے، پھر زید کا انتقال ہو گیا، آیا زید کے دیگر ورثا کا اس زیور میں حصہ ہوگا یا نہیں؟

المستفتی: محمد ابراہیم، محلہ باغ دری، ضلع مئو۔

حکم شرعی:

ہمارے دیار کا عرف یہ ہے کہ بہو کو جو زیور دیا جاتا ہے اس کا مالک اپنے لڑکے کو بنایا جاتا ہے۔ وہ بہو کے واسطے سے اپنے لڑکے کے لیے ہبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کے چند لڑکے ہوتے ہیں وہ سب کو برابر برابر دیتا ہے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں کرتا۔ لہٰذا اگر صورت مسئولہ میں زید کے دیے ہوئے زیورات پر اس کے لڑکے کا قبضہ ہو چکا ہو یعنی زید کی حیات میں اس نے اسے ہاتھ میں لے لیا تو اس کا مالک وہی ہے، وہ زید کا ترکہ نہیں۔ لہٰذا اس میں میراث جاری نہ ہوگی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

عورتوں کو لپ اسٹک لگانا

صورت مسئلہ:

عورتوں کو لپ اسٹک لگانا کیسا ہے، کیا یہ شرعی طور سے حرام وگناہ ہے یا پھر اس کا کیا حکم ہے؟

حکم شرعی:

لپ اسٹک لگانا جائز ہے۔ سنا ہے کہ اس میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے اس لیے اس بچنا بہتر ہے اور تحقیق سے یہ آمیزش ثابت ہو جائے تو اس کا استعمال حرام وگناہ ہے۔

جائز وخلاف اولیٰ ہونے کی صورت میں بھی یہ فرض ہے کہ جنبی اور بے وضو عورت غسل اور وضو کے وقت اسے اچھی طرح چھڑا کر ہونٹ کو صاف کر لیں ورنہ وضو ہوگا نہ غسل کیوں کہ لپ سٹک سے ہونٹ پر تہ جم جاتی ہے جس کے باعث وہاں پانی نہیں پہنچے گا تو وہ پاک نہیں ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

●●

دینی وسماجی بیداری اور ہماری مساجد

ذرا اپنی تاریخ بھی پڑھ لیجیے کہ کیا مسجدوں کا قیام صرف پنج وقتہ نمازوں کی ادائیگی کے لیے ہی کیا گیا تھا؟

از: سید سبحانی

مساجد کو عام طور پر ہم مسلمان محض نماز کی ادائیگی کا ذریعہ سمجھتے ہیں مگر کیا واقعی ایسا ہے؟ وہاں صرف نمازیں ہی پڑھی جاسکتی ہیں؟ کیا دورِ نبوی میں ایسا ہی ہوتا تھا؟ اگر آج مسجدوں کے ذریعے دیگر تعمیری کام کیے اور کرائے جائیں تو ہمارے لوگوں کاری ایکشن کیا ہوگا۔؟ واقعہ یہ ہے کہ مسجدوں سے نمازوں کے علاوہ دیگر تعمیری کاموں کو غیر نہیں ہم ہی لوگ اجنبیت کی نگاہ سے دیکھیں گے مگر آئیے دیکھتے ہیں کہ ہماری تاریخ اس سلسلے میں ہماری کیا رہ نمائی کرتی ہے۔

اسلام کے پیش نظر جس معاشرے کی تشکیل ہے اس معاشرے میں مساجد کا رول کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ اسلامی معاشرہ مسجد سے گہری وابستگی رکھتا ہے اور اس کی طرف بار بار رجوع ہوتا ہے، رب سے اپنے تعلق کو مضبوط اور خوب مضبوط کرنے کے لیے بھی اور بندوں کے ساتھ اپنے تعلقات کو درست اور مطلوبہ انداز میں جاری رکھنے کے لیے بھی۔ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں مساجد کے ساتھ مومنین کا یہ تعلق اور یہ وابستگی بہت ہی پسندیدہ اور مقبول ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سات قسم کے لوگوں کو اپنے عرش کے سائے میں جگہ دے گا، جس دن عرشِ الٰہی کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا، کوئی سہارا نہیں ہوگا۔ اس میں ایک وہ شخص ہوگا جس کا دل مساجد سے مستقل طور پر وابستہ رہتا ہے:

سَبعَۃٌ یُظِلُّھُمُ اللّٰہُ فِیْ ظِلِّہٖ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّہٗ اِمَامٌ عَادِلٌ، وَشَابٌ نَشَأَ فِیْ عِبَادَۃِ اللّٰہِ، وَرَجُلٌ قَلْبُہٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ، وَ رَجُلَانِ تَحَابَّا فِی اللّٰہِ، اِجْتَمَعَا عَلَیْہِ وَتَفَرَّقَا عَلَیْہِ، وَرَجُلٌ دَعَتْہُ امْرَأَۃٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ، فَقَالَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰہَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ بِصَدَقَۃٍ، فَاَخْفَاھَا حَتّٰی لَا تَعْلَمَ شِمَالُہٗ مَاتُنْفِقُ یَمِیْنُہٗ، وَرَجُلٌ ذَکَرَ اللّٰہَ خَالِیًا فَفَاضَتْ عَیْنَاہُ۔

(بخاری، کتاب الاذان، حدیث ۶۴۰)

قرآن مجید میں مساجد کی آبادکاری کو ایمان کے ساتھ مربوط کر کے پیش کیا گیا ہے:

مَا کَانَ لِلْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰہِ شٰھِدِیْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ بِالْکُفْرِ ط اُولٰٓئِکَ حَبِطَتْ اَعْمَالُھُمْ وَ فِی النَّارِھُمْ خٰلِدُوْنَ اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ اَقَامَ الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَی الزَّکٰوۃَ وَ لَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ فَعَسٰٓی اُولٰٓئِکَ اَنْ یَّکُوْنُوْا مِنَ الْمُھْتَدِیْنَ (التوبہ ۹: ۱۷-۱۸) مشرکوں کو زیبا نہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں، جب کہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہیں، ان لوگوں کے سب اعمال بیکار ہیں اور یہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اللہ کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان لاتے اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، یہی لوگ امید ہے کہ ہدایت یافتہ لوگوں میں (داخل) ہوں۔

یہ خدائے ذوالجلال کی جانب سے اُمت مسلمہ کے لیے ایک شان دار انتظام ہے، اپنے رب سے وابستگی کا، اپنے رب کی ہدایات سے وابستگی کا، اور اپنے جیسے دوسرے بندگانِ خدا سے وابستگی کا۔

رب کائنات کی جانب سے اس وابستگی کو یقینی بنانے کے لیے انتظام بھی خوب کیا گیا ہے، روزانہ پانچ وقت باجماعت نماز کے لیے لازمی حاضری کی صورت میں بھی اور ہفتہ میں جمعہ کے روز بڑے اجتماع میں لازمی شرکت کی صورت میں بھی۔

عہدِ نبوی میں مسجد کا کردار:

پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی معاشرے میں مساجد کی اہمیت اور معاشرے کی تشکیل میں مساجد کے غیر معمولی رول کی بہت ہی شان دار اور بہت ہی عملی مثال قائم کی ہے۔ یہ مثال اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی میں اسی آب وتاب کے ساتھ قائم رہی اور آپ کے بعد خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں بھی اسی آب وتاب کے ساتھ جاری رہی۔ دورِ نبوی کی مساجد اور ان مساجد کی سرگرمیاں، بالخصوص مسجد نبوی کے

سلسلے میں وارد روایتوں میں موجود تفصیلات، اسلامی معاشرے میں مساجد کے مطلوبہ رول سے متعلق بہترین رہنمائی پیش کرتی ہیں۔

☆مسجد نبوی میں پنج وقتہ نمازوں کے لیے پورا مسلم معاشرہ جمع ہوتا تھا، مرد بھی جمع ہوتے تھے، خواتین بھی جمع ہوتی تھیں اور بچے بھی جمع ہوتے تھے، اور مسجد میں سب کے لیے اُن کے مناسبِ حال صفیں متعین ہوتی تھیں۔

☆نمازوں کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب بھی کسی اجتماعی رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی آپ خطاب فرمایا کرتے تھے۔ اس وقت بھی پورا مسلم معاشرہ وہاں موجود ہوتا تھا، مرد بھی موجود ہوتے تھے اور خواتین بھی موجود ہوتی تھیں۔

☆جمعہ کے دن آپ کا معمول تھا کہ اس بڑے اجتماع کو مخاطب کرتے ہوئے ہفتہ بھر کے تناظر میں ضروری اور عملی قسم کی رہنمائی پیش فرماتے۔ اس وقت بھی پورا معاشرہ، مرد بھی اور خواتین بھی، مسجد میں موجود ہوتا۔

☆اس کے علاوہ آپ کا معمول تھا کہ مختلف اوقات میں مسجد میں ٹھہرتے، وہاں آپ کی مجلس لگتی، جہاں مرد وخواتین سب کے لیے موقع ہوتا کہ وہ حسب ضرورت مختلف اُمور کے سلسلے میں آپ سے انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی رہنمائی حاصل کرسکیں۔ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک بار خواتین نے مطالبہ کیا کہ بہت سے مسائل وہ ہیں جو اس طرح کی مجلسوں میں وہ نہیں پوچھ سکتی ہیں لہٰذا ایک دن اُن کے لیے مختص کردیا جائے، جس میں وہ اپنے مخصوص مسائل کے سلسلے میں واضح رہنمائی حاصل کرسکیں۔ ان مجلسوں کے علاوہ بھی جب کبھی آپ ضرورت محسوس کرتے، مسجد میں جمع ہونے کا حکم دے دیتے اور سارا مدینہ آپ کو سننے کے لیے بے تابی کے ساتھ وہاں موجود ہوتا۔

☆مسجد نبوی میں منعقد مجالس محض تذکیری یا دینی مجالس ہی نہیں ہوتی تھیں بلکہ ان مجالس میں کافی تنوع پایا جاتا تھا۔ کبھی شعر و شاعری کی مجلس منعقد ہوتی اور شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابت اور دیگر شعرائے رسول سامعین کو محظوظ کررہے ہوتے، اور کبھی کسی قسم کا مسابقہ منعقد ہوتا جہاں شرکاے مسابقہ اپنے اپنے جوہر دکھارہے ہوتے اور وہاں موجود دیگر افراد بھی محظوظ ہورہے ہوتے۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ کچھ حبشی اپنے مخصوص کھیل کھیل رہے تھے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کی اُوٹ میں کھڑی وہ کھیل دیکھ رہی تھیں [4]

☆'صفہ' مسجد نبوی کی سرگرمیوں کا ایک اہم ترین پارٹ تھا۔ یہ طالبانِ حق کے لیے بھی ایک شان دار ٹھکانہ تھا اور کمزور و پریشان حال افراد کے لیے بھی ایک بہترین ٹھکانہ تھا۔ دن میں یہاں تعلیمی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں اور رات میں ضرورت مند افراد یہاں قیام کرتے تھے۔ صفہ سے متعلق اِن افراد کے کھانے پینے کا نظم معاشرے کے ذمہ رہتا تھا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں سے بھی اِن کے لیے کھانا آتا اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے یہاں سے بھی۔

☆مسجد نبوی خدمت خلق کا مرکز بھی تھی۔ کوئی مسافر، پریشان حال، مسکین، ضرورت مند آگیا تو اُس کو یہاں بہترین سہارا ملتا۔ مشہور واقعہ ہے کہ قبیلہ مضر کے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، جو کُرتوں سے بے نیاز، کمبل یا عبا لپیٹے ہوئے اور گلے میں تلوار لٹکائے ہوئے تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر آپ کا چہرہ مبارک متغیر ہوگیا۔ آپ گھر کے اندر گئے اور پھر فوراً ہی باہر نکل آئے اور حضرت بلال سے اذان دینے کے لیے کہا۔ حضرت بلال نے اذان دی پھر اقامت کہی، آپ نے نماز پڑھائی اور پھر حاضرین سے خطاب فرمایا۔ آپ نے سورۃ النساء کی پہلی آیت اور سورۂ حشر کی ۱۸ ویں آیت پڑھی اور اس کے بعد فرمایا: ''ہر شخص اپنے دینار و درہم، کپڑے، گندم اور جَو کی مقدار میں سے صدقہ و خیرات کرے''۔ پھر فرمایا: ''(خیرات کرو) چاہے کھجور کا ایک ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو'' لوگ آتے گئے اور کھانے کی چیزوں اور کپڑوں کے ڈھیر لگاتے چلے گئے، جسے دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ آفتاب کی طرح چمک اٹھا۔

☆مسجد نبوی اس کے علاوہ دوسری سماجی ضرورتوں کی تکمیل بھی کرتی تھی۔ وفود تشریف لاتے تو انھیں وہاں ٹھہرایا جاتا، رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم یہیں آکر ان سے ملاقاتیں کرتے اور ان کے سامنے اپنے مشن کا تعارف کراتے۔ یقینا یہ وفود مسلمان نہیں ہوتے تھے، بلکہ روایات میں صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ آپ نے ایک بار نجران کے ایک بڑے عیسائی وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ طائف کے مشرک وفد کو بھی آپ نے خاص اہتمام کے ساتھ مسجد میں قیام کرایا،

اور صحابہ کرام کو اس بات کی ہدایت کی کہ ان کا قیام اس طرح ہونا چاہیے کہ تلاوت قرآن کی آوازان کے کانوں تک آسانی سے پہنچ سکے۔ اسی طرح آپ سے ملنے دُور دراز سے مہمان تشریف لاتے تو مسجد نبوی ہی میں ان کے قیام اور ان کی ضیافت کا نظم کیا جاتا۔

عہد حاضر کے تقاضے:

یہ نبوی معاشرے میں مسجد نبوی کے غیر معمولی رول کی چند اہم جھلکیاں ہیں، حالانکہ مسجد نبوی کا رول اس سے کہیں زیادہ اہم اور اس سے کہیں زیادہ وسیع اطراف و جوانب کا حامل ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ مسجد نبوی ایک آئینہ ہے جس کو سامنے رکھ کر دنیا بھر کی مساجد کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔

فی الوقت صورتِ حال یہ ہے کہ اسلامی معاشرے کا یہ اہم ادارہ اپنے کردار سے بڑی حد تک محروم ہو گیا ہے۔ زمانے کی گرد اِس پر کچھ ایسی چڑھی کہ یہ اپنے کردار کی وسعت اور ہمہ گیری سے بھی محروم ہو گیا اور اپنی افادیت اور تاثیر سے بھی۔ دھیرے دھیرے اس سے وابستگی کا دائرہ بھی کافی محدود اور تنگ ہوتا چلا گیا۔

آج کے گئے گزرے حالات میں بھی بحیثیت مجموعی مسلم معاشرہ روحانی اور فکری طور پر مساجد سے بڑی حد تک وابستگی اور تعلق رکھتا ہے، اور یہاں سے اپنی زندگی میں پیش آنے والے مسائل اور مشکلات میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ذہنی طور پر خود کو آمادہ محسوس کرتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مساجد کو دوبارہ اسلامی تبدیلی کا بنیادی مرکز بنایا جائے۔ اس کی افادیت کو نہ تو پنج وقتہ نمازوں اور تاثیر سے محروم خطباتِ جمعہ تک محدود رکھا جائے اور نہ مکاتب اور حفظ و تجوید کی کلاسوں ہی تک محدود کر دیا جائے۔

اسلامی تبدیلی کا بنیادی مرکز پہلے مرحلے میں کم از کم اس طور پر بنایا جائے کہ معاشرہ ہر ہر قدم پر یہاں سے دینی رہنمائی حاصل کر سکے، بالخصوص انسانی زندگی میں پیش آنے والے معاملات سے متعلق صحیح اور بروقت دینی رہنمائی کا یہاں بھرپور انتظام ہو، چاہے یہ معاملات عائلی زندگی سے متعلق ہوں، چاہے کاروباری زندگی سے متعلق ہوں، چاہے زندگی کے دوسرے کسی شعبے سے متعلق ہوں۔

اس کے لیے مسلم معاشرے کو دوبارہ اس مرکز سے وابستہ کرنا ہوگا۔ اس سے وابستگی کے دائرے کو اسی طرح وسیع کرنا ہوگا جس طرح یہ عہد نبوی میں تھا۔ مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی اس سے وابستہ کرنا ہوگا تاکہ وہ اپنی شخصیت کی تزئین اور اپنے گھر کی تعمیر ربانی ہدایات سے واقفیت کی بنیاد پر اور ان کے مطابق کریں۔ بچوں کو بھی اس سے وابستہ کرنا ہوگا تاکہ ان کی اُٹھان مسجد میں آتے جاتے ہوئے اور اسلامی ماحول اور اسلامی رہنمائی سے انسیت اور لگاؤ کے ساتھ ہو۔

مساجد میں امام کے منصب پر ایسے فرد کا تقرر کرنا ہوگا جو معاشرے کے درمیان رائج زبان میں اور معاشرے کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھتے ہوئے گفتگو کر سکتا ہو۔ جو دین اور دینی معاملات کا کم از کم اتنا فہم رکھتا ہو کہ وہ معاشرے میں اٹھنے والے معمول کے مسائل کو سمجھ سکے اور ان کے سلسلے میں دینی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دے سکے۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ایک طرف مساجد اپنے حقیقی کردار اور اپنی حقیقی تاثیر سے محروم ہیں۔ دوسری طرف ان مساجد کا دامن تنگ سے تنگ تر کر دیا گیا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ مسلم معاشرے کی اس مرکز سے عہد نبوی جیسی وابستگی اسی صورت ممکن ہو سکے گی، جب کہ اس کی افادیت اور تاثیر میں مطلوبہ حد تک اضافہ ہو، یہاں تک کہ معاشرہ اس کے اندر خود بخود اپنے لیے کشش اور لگاؤ محسوس کرنے لگے۔ مساجد کے منبر سے ہونے والے عربی زبان کے خطبات جن کو سمجھنے سے سامعین مکمل طور پر قاصر ہوتے ہیں، بیانات کے نام پر کچھ ایسے پندونصائح جن کا سامعین کی عملی زندگی سے دُور دُور تک تعلق نہیں ہوتا، یا پھر دوران تقریر ایسے مطالبات جو نہ تو شریعت میں مطلوب ہیں اور نہ عام معاشرے ہی کے لیے ان مطالبات کو پورا کرنا ممکن ہے، ان خطبات، بیانات اور تقاریر کے اندر سوائے حصول ثواب کے 'عنصر' کے ایسا کچھ نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر وہ مسلم معاشرے کے عام افراد کو اپنی جانب متوجہ کر سکیں۔

اس لیے ضروری ہے کہ خطباتِ جمعہ میں خاص طور پر اس امر کا اہتمام کیا جائے کہ تذکیر و تبشیر کے ساتھ ساتھ، مسلم معاشرے اور سامعین کی معاصر زندگی کے حوالے سے دعوت، تلقین اور رہنمائی کی جائے۔ عہد حاضر جس رخ پر چل رہا ہے، ہماری ذمے داری اور بالخصوص ہمارے بڑوں کی ذمے داریاں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔

●●

۴۱

عہدِ رسالت کے سفیر صحابۂ کرام

جس عظیم انسان نے سب سے پہلے سفارت کاری کا تصور پیش کیا وہ صرف اور صرف ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں

از: محمد ریاض علیمی

آپ اگر پڑھے لکھے ہیں تو آپ یقیناً آگاہ ہوں گے کہ ہر ملک میں دنیا کے ہر ہر ملک کے الگ الگ سفارت خانے ہوتے ہیں ان سفارت خانوں میں دنیا کے دیگر ممالک کے سفیر یا یوں کہیے کہ نمائندے بیٹھتے ہیں۔ان نمائندوں کا کام یہ ہوتا ہے کہ اپنے ملک کی ترقیاتی اور فلاحی اِسکیموں اور تجارتی و معاشی سرگرمیوں سے متعلقہ ملک کو واقف کراتے رہیں اور دونوں ملکوں کے درمیان کسی بھی طرح کے معاہدے کا ایک طرح سے پل کا کام کریں۔ بلفظ دیگر یوں کہیے کہ یہ سفیر دراصل اپنے ملک کے لیے ایک 'مبلغ' کا فریضہ انجام دیتے ہیں مگر آپ نے کبھی غور کیا ہے کہ سفارت کا تصور کہاں سے آیا اور یہ سب سے پہلے کس نے پیش کیا، آیئے دیکھتے ہیں۔

اِبتدا میں اسلام کا پیغام ایک مختصر علاقے تک محدود تھا لیکن جب اسلام کو کچھ قوت عطا ہوئی اور مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تو اسلام کا پیغام بھی اپنی محدود حدوں سے باہر نکلنے لگا۔جب اسلامی ریاست باقاعدہ طور پر وجود میں آئی تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے پیغام کو دیگر ممالک اور ان کے حکمرانوں تک پہنچانے کے لیے اپنے چند صحابۂ کرام کو یہ ذمہ داری سونپی۔آقائے کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن چنیدہ صحابۂ کرام کو دینِ اسلام کا پیغام دے کر مختلف ریاستوں کے سربراہوں کی جانب روانہ فرمایا۔یہی صحابۂ کرام عہدِ رسالت کے سفیر صحابۂ کرام کہلائے۔انھی کی بدولت اسلامی ریاست کے تعلقات دیگر ریاستوں سے بڑھنا شروع ہوئے اور اسلام کا پیغام بھی اپنی محدود حدوں سے باہر نکلنا شروع ہوا۔عہدِ رسالت میں جن صحابۂ کرام نے سفارت کے فرائض انجام دیے ان کے تذکرے مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت دِحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

یہ تاریخِ اسلام میں 'دِحیہ کلبی' کے نام سے مشہور ہیں۔یہ اُن صحابۂ کرام میں شامل ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سفیر اسلام بنا کر شاہِ روم ہرقل کی طرف روانہ فرمایا تھا۔آپ کا شمار کبار صحابۂ کرام میں ہوتا ہے۔آپ با اخلاق اور بردبار شخصیت کے حامل تھے۔آپ کفار کے خلاف جہاد میں بھرپور حصہ لیتے تھے۔آپ کا شمار اُن صحابۂ کرام میں ہوتا ہے جو فتویٰ بھی دیتے تھے۔آپ شان دار شخصیت کے حامل تھے۔آپ کی خوبصورتی کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جبرائیل، میرے پاس دِحیہ کلبی کی صورت میں آیا کرتے تھے۔آپ میں قیادت کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔آپ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے تک حیات رہے اور آپ نے ۵۰ھ میں وفات پائی۔

حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت عبداللہ بن حذافہ وہ جلیل القدر صحابی ہیں جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہِ ایران کسریٰ کی طرف پیغام اسلام پہنچانے کے لیے سفیر بنا کر بھیجا تھا۔الاستیعاب میں مذکور ہے کہ آپ، صحابۂ کرام میں خوش مزاج طبیعت کے مالک تھے۔آپ غزوات میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شانہ بشانہ رہتے تھے۔یہاں تک کہ حجۃ الوداع میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے۔آپ کو ہجرتِ مدینہ کے ساتھ ہجرتِ حبشہ کا شرف بھی حاصل ہے۔آپ بہت جری اور بہادر صحابی تھے۔ایک مرتبہ حضرت عمر نے آپ کو ایک لشکر کے ساتھ روم کی طرف روانہ کیا۔

رومی فوج نے آپ کو گرفتار کر کے اپنے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔روم کے بادشاہ نے کہا کہ آپ نصرانیت اختیار کر لیں ہم آپ کو اقتدار میں شریک کر لیں گے۔آپ کے انکار پر بادشاہ نے ان کے لیے پھانسی کا حکم دے دیا۔لیکن آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا ایسا ثبوت دیا کہ آپ سزا کے خوف سے بالکل بھی نہیں گھبرائے

۔شاہِ روم نے ایک دیگ لانے کا حکم دیا۔اس دیگ میں پانی ڈالا گیا اوراس کے نیچے آگ جلادی گئی۔جب پانی کھولتا ہوا گرم ہوگیا تو اس میں ایک قیدی کو پکڑ کر ڈال دیا گیا جس سے اس کے جسم کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہوگیا۔شاہِ روم نے ایک مرتبہ پھر آپ کو کہا کہ نصرانیت قبول کرلو ورنہ تمہیں بھی دیگ میں ڈال دیا جائے گا۔

جب آپ کو دیگ میں ڈالنے کے لیے سپاہی آگے بڑھے تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔شاہِ روم نے رونے کی وجہ پوچھی تو آپ نے جواب دیا۔میری دلی تمنا ہے کہ میری سوجانیں ہوں اوران تمام جانوں کواللہ کی راہ میں اسی طرح کھولتے ہوئے پانی میں پھینک کرختم کیا جائے۔یہ بات سن کرشاہِ روم بہت حیران ہوااور کہا کہ اگر تم میرے سر کو چوم لوتو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔اس طرح آپ کی وہاں سے جان بخشی ہوئی۔آپ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مصر میں وفات پائی۔

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت حاطب بن ابی بلتعہ کا شمار بھی سفیر صحابۂ کرام میں ہوتا ہے۔آپ کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصر کے حکمران ''مقوقس'' کے پاس اپنا سفیر بنا کر بھیجا تھا۔آپ نے اپنی دانش مندی اور حاضر جوابی سے مقوقس کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔آپ اناج کی تجارت کیا کرتے تھے۔زمانۂ جاہلیت میں آپ کا شمار بہترین شعرا میں ہوتا تھا لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد آپ نے شاعری کو خیر باد کہہ دیا تھا۔

آپ بہترین شہسوار، نیزہ باز اور تیر انداز تھے۔آپ کو شمشیر زنی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔آپ نے غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد میں بہترین تیر اندازی کا مظاہرہ کیا تھا۔آپ فتح مکہ، بیعتِ رضوان اور صلح حدیبیہ میں بھی شریک تھے۔آپ چھوٹے قد کے مالک اور بہت حسین وجمیل تھے۔سیاسی معاملات کا وسیع تجربہ رکھتے تھے۔آپ نے سفارت کے فرائض نہایت کامیابی اور بہادری سے انجام دیے۔ آپ کی وفات ۳۰ھ میں ۶۵ سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں ہوئی۔

حضرت شجاع بن وہب الاسدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت شجاع بن وہب الاسدی کو السابقون الاولون میں ہونے کی سعادت حاصل ہے۔آپ کا شمار بھی سفیر صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔آپ کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''رئیسِ یمامہ حارث بن ابی شمر غسانی'' کی طرف سفیر بنا کر بھیجا تھا جو کہ بہت سخت دل اور جنگجو تھا۔آپ کا شمار بدری صحابہ کرام میں بھی ہوتا ہے۔آپ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تمام غزوات میں حصہ لیا اور بہترین مجاہد ہونے کا ثبوت دیا۔

آپ دراز قد اور کمزور جسم کے مالک تھے۔بڑے پختہ عزم اور دلیر تھے۔آپ رعب دار شخصیت کے حامل تھے۔آپ کی گفتگو میں بڑی فصاحت وبلاغت ہوا کرتی تھی۔صبر، حکمت، دانشمندی اور منصوبہ بندی میں کمال رکھتے تھے۔آپ نے ۱۱ھ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑی گئی، جنگ میں جامِ شہادت نوش کیا۔اس وقت آپ کی عمر ۴۵ سال تھی۔

حضرت سلیط بن عمرو العامری رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت سُلیط بن عمرو العامری دائرۂ اسلام میں داخل ہونے والے اکیسویں صحابی تھے۔آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجد کے علاقے یمامہ کے دو رئیسوں ہوذہ بن علی اور ثمامہ بن اثال کی طرف سفیر بنا کر بھیجا تھا۔جب اہل مکہ نے مسلمانوں پر ظلم وستم شروع کیا تو آپ کی حالتِ زار دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حبشہ کی جانب ہجرت کرنے کا حکم فرمایا تھا۔آپ بڑے فصیح وبلیغ، تجربہ کار، اخلاق حسنہ سے آراستہ، صبر وتحمل کے خوگر، بڑے منصوبہ ساز اور ذہین وفطین صحابی تھے۔آپ نے حضرت ابوبکر صدیق کے دورِ خلافت میں ۱۱ھ میں لڑے جانے والے معرکۂ یمامہ میں مسیلمہ کذاب سے جنگ کرتے ہوئے شہادت کا مقام پایا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت عمرو بن العاص بڑے جلیل القدر صحابی تھے۔آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمان کے دو رئیسوں جیفر بن جلندی اور عبد بن جلندی کی طرف سفیر بنا کر بھیجا تھا۔آپ کا پیشہ تجارت تھا۔آپ تجارت کی غرض سے دوسرے ممالک جایا کرتے تھے۔آپ نے فتح مکہ سے چھ ماہ قبل اسلام قبول کیا۔آپ کے والد ''عاص بن وائل'' کا شمار اسلام کے سخت ترین دشمنوں میں ہوتا تھا۔حضرت عمرو بن العاص بہت بہادر سپاہی تھے۔آپ نے بڑی کمال، جراءت وشجاعت، حکمت

اور دانائی سے پورے مصر کو اسلامی سلطنت کا حصہ بنا لیا تھا۔

جب آپ کو مصر کو گورنر بنایا گیا تو آپ نے بہت سی اصلاحات کیں۔ نئے شہر آباد کیے، نئی نہریں کھدوائیں اور زراعت کے کام کو فروغ دیا۔ آپ کے ترقیاتی منصوبوں کی وجہ سے مصر جلد ہی ایک خوشحال ریاست میں تبدیل ہو گیا تھا۔ آپ کی کوشش سے علاقے کے اکثر باشندے دائرۂ اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ آپ عید الفطر کے دن یکم شوال ۴۳ھ میں اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔

حضرت علاء بن الحضرم رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت علاء بن الحضرمی کا شمار بھی سفیر صحابۂ کرام میں ہوتا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو معرکۂ جعرانہ سے واپس آ کر بحرین کے حکمران منذر بن ساوی العبدی کی طرف سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ آپ نے ۸ ہجری میں فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا۔ آپ پہلے جرنیل ہیں جنہوں نے سمندر کے ذریعے سفر کیا۔ آپ جلیل القدر صحابی، ایک روشن دماغ سفیر، ایک تجربہ کار منتظم، فاتح جرنیل، محدث اور فقیہ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔

آپ نے سفارت کے فرائض انتہائی کامیابی کے ساتھ اس خوبی سے انجام دیے کہ ایک قطرہ خون بہائے بغیر پورے بحرین کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔ آپ کی دعوت پر بحرین کے تمام عرب مسلمان ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ بحرین کا حاکم منذر بن ساوی بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہو گیا تھا۔ آپ کا انتقال بحرین سے بصرہ جاتے ہوئے ''لیاس'' کے مقام پر ہوا جہاں آپ کو غسل دینے کے لیے پانی میسر نہیں تھا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے بارش نازل فرمائی، اس طرح آپ کو بارش کے پانی سے غسل دیا گیا۔

حضرت حارث بن عمیر الازدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت حارث بن عمیر الازدی بھی ایک سفیر صحابی تھے جنہیں آقائے کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''شاہِ بصریٰ'' کی جانب اسلام کا پیغام دے کر بھیجا تھا۔ آپ کا شمار فصیح و بلیغ صحابۂ کرام میں ہوتا ہے۔ آپ نے فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کیا تھا۔ آپ حسنِ اخلاق سے آراستہ، صابر و شاکر، صداقت کے خوگر، حسین و جمیل اور بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ آپ بحیثیتِ سفیر خدمات انجام نہیں دے سکے کیوں کہ آپ کو ملکِ شام کی جانب جاتے ہوئے مؤتہ کے مقام پر شرحبیل بن عمرو الغسانی نے شہید کر دیا تھا۔ آپ پہلے اور واحد سفیر تھے جنہیں شہید کیا گیا تھا۔ آپ کے علاوہ کوئی سفیر قتل نہیں ہوا تھا۔[4]

حضرت مہاجر بن ابی امیہ القرشی المخزومی رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت مہاجر بن ابی امیہ القرشی المخزومی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ مطہرہ حضرت اُم سلمہ کے بھائی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ۹ ہجری میں یمن کی طرف حارث بن عبد کلال الحمیری کے پاس سفیر اسلام بنا کر بھیجا تھا۔ آپ پھرتیلے مجاہد، بڑے کامیاب قائد اور تجربہ کار سفیر تھے۔ آپ بااخلاق، صابر و شاکر، دانش ور، عالم و فاضل، منصوبہ ساز اور ذہین و فطین صحابی تھے۔

آپ حسین و جمیل ہونے کے ساتھ ساتھ بارعب شخصیت کے مالک تھے۔ آپ نے سفارت کے فرائض کامیابی اور خوش اسلوبی سے ادا کیے۔ آپ کی دعوت سے حارث الحمیری کے ساتھ بہت سارے یمنی باشندے اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ آپ ایک بہترین سفیر، گورنر اور کامیاب جرنیل کی حیثیت سے تاریخِ اسلام میں پہچانے جاتے ہیں۔

حضرت جریر بن عبد اللہ الجلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت جریر بن عبد اللہ الجلبی ایک بہادر اور باصلاحیت صحابی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو ۱۱ ہجری میں یمن کے سردار ذوالکلاع کی طرف سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمانوں کے لشکر کی قیادت کرتے ہوئے ذی الخلصہ کے صنم کدہ کو جلا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش کیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے لشکر کے لیے خیر و برکت کی دعا فرمائی تھی۔

جنگِ حیرہ کے موقع پر جب مسلمان ہزیمت کا شکار ہو رہے تھے تو آپ نے ایسی شجاعت دکھائی جس سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا تھا اور مجاہدین آپ کی جراءت، شجاعت اور شمشیر زنی کو دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔ اسی طرح جنگِ یرموک کی کامیابی میں آپ کے ماہرانہ جنگی مشوروں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ آپ کی جنگی اور انتظامی صلاحیتوں کے اعتراف میں آپ کو دربارِ خلافت کی جانب سے اہم عہدوں پر فائز کیا گیا تھا۔ آپ نے ۵۴ھ میں قرقیسیاء کے مقام پر اپنی اقامت گاہ میں وفات پائی۔

حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت جعفر طیار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے اور آپ اسلام کے سب سے پہلے سفیر تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے ہاتھ ملکِ حبشہ کے حاکم نجاشی کے نام ایک مکتوب گرامی بھیجا تھا جس میں مہاجرین کے ساتھ حسنِ سلوک کے برتاؤ کا حکم تھا۔ آپ اپنے بھائیوں میں سب سے زیادہ حسین وجمیل تھے۔ آپ ہاشمی خاندان کے خوبصورت جوان تھے۔

آپ غربا، فقرا، مساکین اور حاجت مندوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ آپ کی سخاوت کی وجہ سے آپ کو ''ابوالمساکین'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آپ نے دو ہجرتوں حبشہ اور مدینہ کی سعادت حاصل کی۔ آپ نے نجاشی کے دربار میں سفارت کے فرائض نہایت خوش اُسلوبی سے ادا کیے۔ آپ کی رقت انگیز گفتگو نے حبشہ کے حکمران نجاشی کے دل میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ آپ غزوۂ موتہ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ کے جسم مبارک پر تیر اور تلواروں کے نوے سے زیادہ زخم تھے۔ کئی دنوں تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جعفر کی شہادت کا شدید غم رہا۔ یہاں تک کہ حضرت جبریل نے یہ بشارت سنائی کہ اللہ نے حضرت جعفر کو کٹے ہوئے بازوؤں کے بدلے میں دو نئے بازو عنایت فرمائے ہیں جن سے وہ جنت کے فرشتوں کے ساتھ محو پرواز رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضرت جعفر کا لقب ''طیار'' اور ''ذو الجناحین'' ہو گیا تھا۔

حضرت عمرو بن امیہ الضمری رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت عمرو بن اُمیہ الضمری کا شمار بھی سفیر صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ ۶ ھ کے اواخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حکمرانوں کے نام جو تبلیغی خطوط لکھے گئے تھے ان میں سے حبشہ کے نیک صفت بادشاہ نجاشی کے بھی نام خط تھا، اس خط کو پہنچانے کی ذمہ داری آپ کو سونپی گئی تھی۔ آپ ہی کی دعوت پر نجاشی نے اسلام قبول کیا تھا۔ حضرت عمرو بن اُمیہ نے اس وقت اسلام قبول کیا تھا جب مشرکین غزوۂ اُحد کے بعد واپس پلٹ رہے تھے۔ آپ جراءت و شجاعت اور شرافت کے اعتبار سے عرب کی مشہور و معروف شخصیات میں سے تھے۔ قریشِ مکہ آپ کو نہایت ذہین اور فعال سمجھتے تھے۔ آپ نے عہد نبوی میں ممتاز سیاسی خدمات سرانجام دیں۔ آپ نے حضرت امیر معاویہ کے عہد کے آخری ایام میں مدینہ منورہ میں وفات پائی۔[4]

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت عثمان بن عفان اسلام کے تیسرے خلیفہ ہیں۔ آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان اور دیگر رؤسائے مکہ کی طرف سفیر بنا کر بھیجا تھا۔ آپ شرم وحیا کا پیکر تھے۔ آپ نہایت سخی تھے۔ آپ نے اپنے مال سے مسلمانوں کی کئی مواقع پر مدد کی۔ جس وقت مسلمانوں کو پانی کی پریشانی کا سامنا تھا تو آپ نے بیس ہزار درہم میں ''بئرِ رومہ'' نامی کنواں خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آپ کا شمار اولین صحابہ کرام میں ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یکے بعد دیگرے اپنی دو صاحبزادیاں حضرت رقیہ اور حضرت ام کلثوم آپ کے نکاح میں دی تھیں۔ اسی وجہ سے آپ ذوالنورین (یعنی دو نور والے) کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے۔

آپ نے سوائے غزوۂ بدر کے تمام غزوات میں شرکت کی۔ غزوۂ بدر میں آپ کی عدم شرکت کے باوجود آقائے کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو بدری صحابہ میں شمار کیا ہے۔ آپ تقریباً چھ سال تک مسلمانوں کے خلیفہ رہے۔ آپ نے اپنے دورِ خلافت میں اسلامی حکومت کی حدود کو کافی وسعت دی تھی۔ آپ کی شہادت ۳۵ ھ میں ہوئی۔ آپ کو اس وقت شہید کیا گیا جب آپ تلاوتِ قرآن میں مصروف تھے۔ آپ کی تدفین جنت البقیع میں کی گئی۔

درج بالا صحابہ کرام نے انتہائی خلوص اور کامیابی کے ساتھ سفارت کے فرائض انجام دیے اور اسلام کے پیغام کو دنیا تک پہنچایا۔ مختلف قوموں اور ریاستوں کے درمیان باہمی تعلقات اور دو طرفہ معاہدات کے لیے قدیم زمانے سے سفارتی سرگرمیاں تاریخ میں نظر آتی ہیں۔ جنگی معاملات اور تجارتی امور پر بھی سفیروں کے ذریعے رابطہ قائم کیا جاتا تھا۔ جب سفارتی رابطہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی تو ایسے صحابۂ کرام کو سفیر بنا کر بھیجا جاتا تھا جو ذہین اور سمجھدار ہونے کے ساتھ اور اپنی بات مؤثر انداز میں پیش کرنے اور دوسرے سے اپنی بات منوانے کے گُر بھی جانتے تھے۔

● ●

موسیقی سے قرآن تک

امریکہ کی خاتون دانش ور کی قبول اسلام کی داستان

از: مریم جمیلہ

محترمہ مریم جمیلہ یہودی النسل امریکی پاکستانی خاتون دانش ور ہیں۔ وہ ۲۳ مئی ۱۹۳۴ کو نیویارک میں پیدا ہوئیں۔ ان کا سابقہ نام 'مارگریٹ مارکس' تھا۔ شعور کو پہنچتے ہی انہیں اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ انہوں نے اسلام کے متعلق بے تحاشہ معلومات حاصل کیں اور یوں ۱۹۶۱ میں انہوں نے اسلام قبول کرلیا اور قبول اسلام کے بعد مختلف موضوعات پر ۳۰ سے زائد نہایت معرکہ آرا اور غیر معمولی کتابیں تصنیف کیں۔ یہ ساری کتابیں انگریزی زبان میں ہیں اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ زیر نظر تحریر انھی کے قلم سے نکلی ہے جس میں انھوں نے اپنے قبول اسلام کی داستان تحریر کی ہے۔ اس عظیم مصنفہ کا انتقال ۳۱/ اکتوبر ۲۰۱۲ کو لاہور میں ہوا۔ (مدیر)

قرآن مجید تک رسائی حاصل کرنے کے لیے مجھے عجیب اور پیچیدہ راستے اختیار کرنے پڑے۔ چوں کہ میں منزل پر بڑے احسن طریق سے پہنچی اس لیے مجھے اپنے تجربات پر کبھی بھی افسوس نہیں ہوا۔

عہدِ طفولیت ہی سے مجھے موسیقی بڑی اچھی لگتی تھی۔ خصوصاً وہ گانے تو مجھے بہت ہی پسند تھے جنھیں دیارِ مغرب میں بلند ثقافت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اسکول میں موسیقی میرا پسندیدہ مضمون تھا اور اس میں اکثر مجھے اچھے نمبر حاصل ہوتے تھے۔

جب میں گیارہ سال کی ہوئی تو مجھے ریڈیو پر عربی موسیقی سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ مجھے اتنی پسند آئی کہ میں نے اسے پھر سننے کا فیصلہ کرلیا۔ جب بھی میں عربی موسیقی سنتی، مغربی موسیقی کے لیے میرے دل میں کشش باقی نہ رہتی۔ میں نے والدین کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ ایک دن میرے والد مجھے نیویارک کے شامی علاقے میں لے گئے جہاں سے میں نے اپنے گراموفون کے لیے بہت سے عربی ریکارڈ خریدے۔ ان میں سے جو سب سے زیادہ مجھے پسند آیا وہ [مصری مغنیہ] اُمِ کلثوم کا وہ ریکارڈ تھا جس میں اس نے سورۂ مریم کی تلاوت کی تھی۔ اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ یہ عورت آیندہ کس بُرے راستے پر گامزن ہونے والی ہے لیکن مجھے اس کی سُریلی آواز اور عقیدت بڑی پسند آئی۔ انھی ریکارڈوں کی بدولت میں عربی موسیقی کی گرویدہ بن گئی۔ حالاں کہ میں عربی الفاظ کا مطلب بالکل نہ جانتی تھی۔ عربی موسیقی کی اس بنیادی قدر ومنزلت کے بغیر میرے دل میں تلاوت کی محبت پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ حالانکہ یہ ایک مغربی باشندے کے لیے اجنبی تھی۔ میرے والدین، رشتہ دار اور احباب عربی اور عربی موسیقی کو از حد دقیانوسی اور تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ اس لیے جب میں ریکارڈ بجانے لگتی تو ان کا ہمیشہ یہی مطالبہ ہوتا کہ میں تمام دروازے اور کھڑکیاں بند کرلوں تاکہ وہ پریشان نہ ہوں۔

۱۹۶۱ء میں قبولِ اسلام کے بعد، نیویارک کی مسجد میں بیٹھ کر جب مشہور ومعروف مصری قاری عبدالباسط کی تلاوت کا ٹیپ ریکارڈ سنتی تو مسحور ہوجاتی۔ لیکن ایک نماز جمعہ میں امام صاحب نے ریکارڈ نہ بجایا کیوں کہ اس دن ایک مہمانِ خصوصی آیا ہوا تھا۔ یہ ایک پستہ قامت معمولی لباس میں ملبوس سیاہ فام نوجوان تھا جو زنجبار کا ایک طالب علم تھا۔ جب اس نے سورۂ رحمٰن کی تلاوت شروع کی تو ایسا معلوم ہوا کہ میں نے اس سے پہلے اتنی شان دار تلاوت کبھی نہیں سنی، قاری عبدالباسط بھی اس کے مقابلے میں ہیچ تھا۔ اس سیاہ فام افریقی نوجوان کی آواز نہایت سریلی تھی۔ غالباً حضرت بلال حبشی کی آواز بھی بہت کچھ اس سے ملتی ہوگی! (یہ مصنفہ کا اپنا خیال ہے)۔

دس سال کی عمر ہی میں مَیں نے عربوں کے متعلق وہ ساری کتابیں پڑھ ڈالیں جو مجھے اسکول یا اپنے یہودی فرقے کی لائبریریوں سے حاصل ہوسکیں۔ خصوصاً وہ کتب جن میں یہودیوں اور عربوں کے تاریخی تعلقات کا ذکر تھا۔ لیکن قرآن مجید کے متعلق اپنے تجسّس کی تسلی کرنے میں نو سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا۔ آہستہ آہستہ جب بلوغت کی عمر کو پہنچی تو مجھے یقین ہوگیا کہ اسلام کو عربوں نے اس بلند مرتبے پر نہیں پہنچایا بلکہ اسلام نے عربوں کو صحرائی بادیہ نشینوں سے

دنیا کا حکمران بنا دیا۔ جب تک میرے دل میں اس انقلاب کی وجوہات دریافت کرنے کا شوق پیدا نہ ہوا اس وقت تک قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے کا خیال بھی پیدا نہ ہوا۔

۱۹۵۳ء کے موسم گرما میں، کالج میں بہت سے مضامین کا کورس اختیار کر لینے سے میرے دل و دماغ پر سخت دباؤ پڑا۔ اگست میں مَیں علیل ہو گئی اور میں نے سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا۔ ایک شام جب میری والدہ پبلک لائبریری جانے لگیں تو مجھ سے پوچھنے لگیں کہ کوئی کتاب منگواؤ گی۔ میں نے کہا کہ مجھے قرآن مجید کا ایک نسخہ لا دیں۔ ایک گھنٹے بعد جب وہ لوٹیں تو ان کے ہاتھ میں قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ تھا۔ جو اٹھارھویں صدی عیسوی کے ایک عیسائی عالم اور مبلغ، جارج سیل نے کیا تھا۔ چوں کہ اس کی زبان بڑی فرسودہ قسم کی تھی اور اس میں عیسائی نقطۂ نگاہ سے متن کو بگاڑنے کے لیے حواشی میں البیضاوی اور زمخشری کے حوالے دیے گئے تھے، اس لیے میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اس زمانے میں اپنے ناپختہ دماغ کی وجہ سے قرآن کو تورات کے مانوس قصص کی مسخ شدہ اور محرف شکل کے سوا کچھ نہ سمجھتی تھی۔ قرآن کے متعلق میرا پہلا تاثر کچھ اور تھا مگر میں اس کے مطالعے سے باز نہ رہ سکی۔ میں تین دن رات تک مسلسل اس کے مطالعے میں منہمک رہی، اور جب میں نے اسے ختم کر لیا تو میری تمام توانائی ختم ہو کر رہ گئی۔ میری عمر اس وقت صرف ۱۹ سال کی تھی اور میرا حال یہ تھا کہ میں اپنے آپ کو ایک ۸۰ سالہ بڑھیا کی طرح کمزور محسوس کرنے لگی۔ اس کے بعد میری پوری توانائی کبھی بحال نہ ہو سکی۔

میں قرآن کے متعلق اپنی اس رائے پر قائم رہی۔ ایک دن میں نے دکان پر محمد مارماڈیوک پکتھال کے انگریزی ترجمۂ قرآن کا ایک سستا اڈیشن دیکھا۔ جونہی میں نے اسے کھولا، وہ میرے لیے ایک عظیم انکشاف ثابت ہوا۔ اس کی فصاحت و بلاغت نے میرے پاؤں اکھاڑ کر رکھ دیے۔ پکتھال نے اپنے دیباچے کے پہلے پیراگراف میں لکھا تھا:

''اس ترجمے کا مقصد انگریزی خواں طبقے کے سامنے یہ بات پیش کرنا ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان قرآن کے الفاظ سے کیا مفہوم لیتے ہیں اور قرآن کی ماہیت کو موزوں الفاظ میں سمجھانا اور انگریزی بولنے والے مسلمانوں کی ضرورت کو پورا کرنا ہے۔ معقولیت کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ کسی الہامی کتاب کو ایک ایسا شخص عمدگی سے پیش نہیں کر سکتا جو اس کے الہامات اور پیغام پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ یہ پہلا انگریزی ترجمہ ہے جو ایک ایسے انگریز نے کیا جو مسلمان ہے۔ بعض تراجم میں ایسی تفسیریں کی گئی ہیں جو مسلمانوں کے لیے دل آزار ہیں اور تقریباً سب میں زبان کا ایسا اندازِ بیان اختیار کیا گیا ہے جسے مسلمان غیر موزوں سمجھتے ہیں۔ قرآن کا ترجمہ ناممکن ہے۔ یہ قدیم شیوخ کا اور میرا عقیدہ ہے۔ میں نے اس کتاب کو علمی انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے لیے کوشش کی گئی ہے کہ موزوں زبان استعمال کی جائے۔ لیکن یہ ترجمہ قرآن مجید نہیں ہو سکتا کیوں کہ وہ تو بے مثل و بے عدیل ہے۔ اس میں اتنی ہم آہنگی ہے کہ لوگ اسے سنتے ہی رونے لگتے اور وجد میں آ جاتے ہیں۔ یہ تو قرآن کے مفہوم کو انگریزی میں پیش کرنے کی محض ایک کوشش ہے اور اس کے سحر کی قدرے عکاسی۔ یہ عربی قرآن کی جگہ نہیں لے سکتا۔ نہ میرا یہ مقصد ہے۔''

اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ جارج سیل کا ترجمہ کیوں اتنا ناموزوں لگا تھا۔ اس کے بعد میں نے اس کا اور دوسرے غیر مسلموں کا ترجمۂ قرآن پڑھنے سے انکار کر دیا۔ پکتھال کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میں نے عبداللہ یوسف علی، مولانا محمد علی لاہوری اور مولانا عبدالماجد دریابادی کے تراجم کا مطالعہ کیا، اور مجھ پر فوراً انکشاف ہوا کہ عبداللہ یوسف علی اور مولانا محمد علی کا ترجمہ و تفسیر غیر موزوں ہے۔ اس کی وجہ ان کا لہجہ اور دور از کار اور غیر معقول کوشش تھی جو انھوں نے ان آیات کی تشریح میں کی تھی جو جدید فلسفے اور سائنسی تصورات سے متصادم ہوتی ہیں۔ ان کے متن کا ترجمہ بھی کمزور تھا۔ گو مولانا دریابادی نے اپنے ترجمے میں تورات کے شاہ جیمز کے ترجمے کے نمونے پر قدیم اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔ اس کے باوجود مجھے ان کی تفسیر عمدہ معلوم ہوئی، خاص کر اس کا وہ حصہ جس میں مختلف مذاہب کا ذکر ہے اور میں نے اس سے بہت کچھ حاصل کیا۔

بہر کیف، پکتھال کا ترجمہ مجھے بہت پسند آیا اور آج تک مجھے اس کے مقابلے کا کوئی انگریزی ترجمہ نہیں مل سکا۔ کسی ترجمے میں وہ فصاحت و بلاغت اور انداز بیان نہیں جو اس میں موجود ہے۔ بہت سے دوسرے تراجم میں اللہ کے لیے 'God' کا لفظ استعمال کرنے کی غلطی کی گئی ہے۔ لیکن پکتھال نے ہر جگہ 'اللہ' ہی استعمال کیا ہے۔ اس

سے اسلام کے پیغام میں مغرب کے قاری کے لیے بڑا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ جب تک میں اسپتال میں صاحب فراش رہی پکتھال کا ترجمہ مسلسل میرے زیرِ مطالعہ رہا۔ میں نے اسے بار بار پڑھا اور اپنے نوٹس سے اس کے چھے عدد نسخے نشان زد کیے۔ اللہ تعالیٰ پکتھال پر برکات نازل کرے جس نے امریکا اور انگلستان کے باشندوں کے لیے قرآن کی تعلیمات کا مطالعہ آسان بنا دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو میں اس سے لاعلم رہتی اور اس کی قدر نہ کر سکتی۔

۱۹۰۹ء میں اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد مَیں فرصت کے اوقات میں نیو یارک پبلک لائبریری کے مشرقی شعبے میں بیٹھ کر اسلام کے متعلق کتب کا مطالعہ کرتی۔ یہیں مجھے مشکوٰۃ المصابیح مترجمہ الحاج مولانا فضل الرحمن کل کتوی کی چار ضخیم جلدوں کا پتا چلا۔ مجھے اس بات کا علم ہوا کہ قرآن مجید کو موزوں اور مفصل طور پر سمجھنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک متعلقہ حدیث کا پتا نہ ہو۔ کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ اور فرمودات کے سوا قرآن حکیم کی تفسیر کس طرح ممکن ہو سکتی ہے جن پر یہ نازل ہوا تھا! وہ لوگ جو منکرِ حدیث ہیں فی الحقیقت وہ منکرِ قرآن ہیں۔

مشکوٰۃ کے مطالعے کے بعد میں نے قرآن کو الہامی کتاب مان لیا۔ جس چیز نے مجھے اس بات کا قائل کر دیا کہ قرآن منجانب اللہ ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں وہ اس کے تسلی بخش اور معقول جوابات ہیں، جو اس نے زندگی کے تمام اہم مسائل کے متعلق دیے ہیں اور یہ ایسے ہیں کہ مجھے کسی دوسری جگہ نہیں ملے۔

میں بچپن میں موت سے بڑی خوف زدہ رہا کرتی تھی۔ خاص کر اپنی موت کے خیال سے اتنا ڈرتی تھی کہ بعض اوقات خواب دیکھنے کے بعد آدھی رات کو چیخنے لگتی اور والدین کو جگا دیتی۔ جب میں ان سے دریافت کرتی کہ میں کیوں مروں گی اور موت کے بعد میرا کیا بنے گا؟ تو وہ صرف اتنا کہہ دیتے کہ وہ ناگزیر ہے اور مجھے اسے قبول کرنا ہوگا۔ اور چوں کہ طبی سائنس ترقی کر رہی ہے شاید میں ایک سو سال تک زندہ رہوں۔ میرے والدین، خاندان کے باقی افراد اور تمام دوست احباب بڑی نفرت کے ساتھ حیات بعد الموت، روزِ حشر، جنت کے انعامات اور دوزخ کی سزا کو توہم پرستی اور فرسودہ عقائد سمجھتے تھے۔

تورات کے انبیا، بطاریق اور اولیا کے متعلق ہمیں معلوم ہے کہ انھیں جزا و سزا اسی دنیا میں ملی تھی۔ حضرت ایوب علیہ السلام کا قصہ مشہور ہے۔ ان کے تمام پیارے فوت ہو گئے، ان کی املاک برباد ہو گئیں اور وہ ایک اذیت ناک مرض میں مبتلا کر دیے گئے تا کہ ان کے ایمان کی آزمایش کی جائے۔ حضرت ایوب نے رو رو کر خدا سے فریاد کی کہ اس نے کیوں ایک نیکوکار انسان کو مصائب میں مبتلا کیا؟ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام دنیاوی نقصانات کی تلافی کر دی لیکن اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ ان کی حیات بعد الموت میں انھیں کیا جزا ملی۔

میں نے انجیل میں بھی اس کا ذکر دیکھا اور اس کا مقابلہ قرآن مجید سے کیا۔ انجیل کا بیان مبہم ہے۔ میں نے قدیم یہودیت میں بھی مسئلہ موت کا کوئی حل نہیں پایا۔ کیوں کہ تالمود کی تعلیم یہ ہے کہ بہترین موت سے بدترین زندگی اچھی ہے۔ میرے والدین کا فلسفہ یہ تھا کہ موت کے خیال کو دل میں ہرگز جگہ نہ دینا چاہیے اور زندگی کی عطا کردہ مسرتوں سے مقدور بھر لطف اندوز ہونا چاہیے۔ ان کے خیال میں زندگی کا مقصد یہ تھا کہ انسان خوش و خرم اور مسرور رہے، اپنے خاندان سے پیار کرے، دوست احباب سے تعلقات بڑھائے اور ان تفریحات میں منہمک رہے جن کی امریکا میں فراوانی ہے۔ وہ زندگی کی اس مصنوعی شکل کے سختی سے قائل تھے۔ گویا یہ ان کی مسرت اور خوش قسمتی کی ضامن تھی۔ میں نے تلخ تجربے سے معلوم کیا کہ ان باتوں سے پریشانی نصیب ہوتی ہے اور ذاتی قربانی اور جدوجہد کے بغیر کوئی قابلِ قدر چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔

میں اپنے بچپن ہی سے اہم اور بڑے بڑے کام کرنا چاہتی تھی۔ سب سے زیادہ میں اس بات کی خواہش مند تھی کہ اپنی موت سے پہلے مجھے یہ یقین حاصل ہو جائے کہ میں نے اپنی زندگی کے ایام پُر معصیت اعمال میں ضائع نہیں کیے۔ میں زندگی بھر سنجیدہ مزاج رہی ہوں۔ میں نے ہمیشہ عصرِ جدید کی ثقافت سے نفرت کی ہے جس کا بڑا چرچا ہے۔ ایک مرتبہ میرے والد نے مجھے یہ کہہ کر سخت پریشان کر دیا کہ: ''دنیا میں کوئی چیز بھی مستقل قدر کی حامل نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہم جدید رجحانات کو ناگزیر سمجھیں اور اپنے آپ کو ان کے سانچے میں ڈھال لیں''۔ لیکن میں ہمیشہ اس بات کی خواہاں رہی کہ کوئی ایسی چیز حاصل کروں جو تا ابد قائم رہے اور

یہ بات میں نے صرف قرآن مجید سے سیکھی کہ ایسا ممکن ہے۔ اگر اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کوئی نیک عمل کیا جائے تو وہ ضائع نہیں ہوتا۔ اگر اسے دنیاوی انعام نہ بھی ملے تو اسے اس زندگی کے بعد ضرور ملے گا۔ قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ وہ لوگ جو اخلاقی اقدار سے رہنمائی حاصل نہیں کرتے اور آزادی سے من مانی کرتے ہیں، انھیں اس دنیا میں کتنی ہی کامیابی اور دولت حاصل کیوں نہ ہو جائے اور وہ اپنی مختصر زندگی کو کتنی ہی حسرتوں میں کیوں نہ بسر کریں، قیامت کے دن ضرور گھاٹے میں رہیں گے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہم حقوق اللہ اور حقوق العباد پورا کرنے پر پوری توجہ دیں اور ایسے تمام اعمال اور سرگرمیوں کو ترک کر دیں جو ہمیں اس راستے سے بھٹکاتی ہیں۔

قرآن کی ان تعلیمات کو احادیث نے اور زیادہ اجاگر کر دیا ہے، اور میں نے انھیں اپنے مزاج کے عین مطابق پایا ہے۔ جب میں آغوشِ اسلام میں آئی میرے والدین، رشتہ داروں اور دوست احباب نے مجھے دیوانی سمجھا کیوں کہ میں اس کے بغیر کسی اور بات کا تصور تک نہ کر سکتی تھی۔ ان کے نزدیک مذہب ایک نجی معاملہ تھا جس میں دوسرے اشغال کی طرح ترقی کی جا سکتی تھی لیکن جب میں نے قرآن مجید کا مطالعہ کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اسلام کسی لہو ولعب کا نام نہیں ہے۔ اسلام زندگی کی محض ضرورت ہی نہیں، بلکہ خود زندگی ہے!

سنِ بلوغت کے آغاز سے، ۲۸ سال کی عمر میں پاکستان آنے تک میں معاشرتی لحاظ سے مکمل طور پر ناموزوں رہی۔ میں ایک سنجیدہ دل و دماغ کی دوشیزہ تھی۔ ہر وقت لائبریری میں کتابوں کے ڈھیر میں غرق رہتی تھی۔ میں سینما، رقص اور موسیقی سے متنفر تھی۔ مجھے مخلوط پارٹیوں سے نفرت تھی۔ مجھے رومان، شان و شوکت، سنگھار، زیورات، فیشن ایبل لباس میں کوئی دل چسپی نہ تھی۔ اس لیے مجھے اس سرد مہری کی پوری سزا ملی۔

میری جیسی ہستی کے لیے امریکا میں کوئی جگہ نہ تھی، اور میں مستقبل سے مایوس تھی۔ میں وہاں سے نکلی اور پاکستان پہنچ گئی۔ اگرچہ پاکستان کی فضا بھی ہر دوسرے مسلم ملک کی طرح، یورپ اور امریکا سے آنے والے خطرناک گرد و غبار سے آلودہ ہے۔ پھر بھی نیک مسلمانوں کی کمی نہیں ہے۔ جن کی بدولت ایک فرد کو ایسا ماحول میسر آ جاتا ہے جس میں وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کر سکتا ہے۔

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ بعض اوقات میں ان باتوں پر عمل پیرا نہیں ہو سکتی جن کا اسلام تقاضا کرتا ہے۔ لیکن میں نے اپنی کمزوریوں کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے قرآن و سنت کی دور از کار تاویلات کرنے کی جراءت نہیں کی۔ میں جب بھی کسی غلطی کی مرتکب ہوتی ہوں، فوراً اس کا اعتراف کر لیتی ہوں اور اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ وہ مسرت جو مجھے اسلام کے دامنِ رحمت میں اپنی حیاتِ نو کے طفیل نصیب ہوئی ہے، سراسر اس حقیقت کی مرہونِ احسان ہے کہ نسوانی کردار کی اُن صفات کو اسلام میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے جنھیں مغربی معاشرے میں نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

●●

انعامات کی حسین رات: شب براءت

41

اس شب میں حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی پر بھی توجہ مرکوز رکھیے!

از: صادق رضا مصباحی

یہ اللہ عزوجل کا بے پایاں فضل وکرم ہے کہ اس نے مسلمانوں کو سال بھر میں وقفے وقفے سے ایسے مواقع عنایت فرمائے ہیں جو مسلمانوں کو آپس میں قریب کرنے، انہیں جوڑنے، اختلافات دور کرنے، مل بیٹھ کر کھانے پینے، بچھڑے ہوؤں کو گلے لگانے، ناراض لوگوں کو منانے اور بغض وکینے کا جڑ و بنیاد سے خاتمہ کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ آپ کسی بھی اسلامی تقریب کا جائزہ لیں سب کا فلسفہ اُخوت و محبت اور ہم دردی و نرم دلی ہی ہے، بس شرط یہ ہے کہ ہم ان اسلامی تقریبات یا یوں کہیے کہ اسلامی تیوہاروں کی طرف کان لگادیں اور ان کے پیغامات سن لیں۔ سبھی کے فلسفے اتحاد و یگانگت سے عبارت ہیں۔ شب براءت بھی ایک ایسی ہی تقریب، روایت یا یوں کہیے کہ اسلامی تیوہار ہے۔ اس رات کی تخلیق اللہ عزوجل نے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کے لیے کی ہے اور جب انسان ایک دوسرے کو معاف کر دیتا ہے، سکھ دکھ میں ساتھ دینے کا عہد کرتا ہے اور سب سے اخلاق ومروت سے پیش آتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے خدا کی رحمت کا وافر حصہ عطا ہوا ہے اور اس منزل پر پہنچ کر انسان کے لیے خدا کے تقرب کی راہیں بھی کھل جاتی ہیں۔ اس کی عظمتیں، برکتیں، سعادتیں، فضیلتیں اور رحمتیں اپنی جگہ مسلم لیکن سب سے عظیم فلسفہ اس رات کا یہی ہے کہ ٹوٹے ہوئے لوگوں کو جوڑا جائے اور ان سے معافی مانگ کر انہیں راضی کر لیا جائے۔ دراصل اس مبارک شب کے سارے فضائل و کمالات ہیں ہی اسی لیے کہ وہ دلوں کی تلخیاں ختم کر کے ہمدردیاں اور محبتیں تقسیم کرتی ہے، مگر ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ ہر چیز روایتی ہوگئی ہے، اس کی روح باقی نہ رہی اس لیے یہ شب براءت بھی بس ظاہری ڈھانچہ ہے اور اس کے مقاصد بہت دور ہو گئے ہیں۔ بڑے ہی نیک بخت ہیں وہ حضرات جو مقاصد کو سمجھتے ہیں اور اس پر نہ صرف عمل کرتے بلکہ اس کی تلقین بھی کرتے ہیں۔

اس مبارک شب میں نوجوان، بچے، بوڑھے، مرد وعورت سبھی خوب خوب عبادت وریاضت کرتے ہیں، شب بیداری کرتے ہیں، اوراد ووظائف کا اہتمام کرتے ہیں، نوافل کی کثرت کرتے ہیں اور حتی الامکان اس شب کے مطالبات پورے کرنے کی کوشش کرتے ہیں گویا حقوق اللہ کی ادائیگی میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ یہ بلاشبہ بڑی سعادت مندی کی بات ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ حرماں نصیبی کی بات یہ ہے کہ حقوق العباد کی ادائیگی میں وہ جذبۂ مسابقت اور وہ جوش و خروش دیکھنے کو نہیں ملتا جو اس مبارک شب کی بنیاد ہے کہ یہ شب حقوق اللہ سے زیادہ حقوق العباد کی درستی پر زور دیتی ہے۔

یاد رکھیے حقوق اللہ اور حقوق العباد دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ حقوق اللہ تو اللہ عزوجل اپنے فضل وکرم سے معاف بھی فرما سکتا ہے مگر حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہو سکتے جب تک بندہ انہیں معاف نہ کر دے مگر یہ کیسی دانش مندی ہے کہ حقوق اللہ کی ادائیگی کا جذبۂ مسابقت تو دیدنی ہوتا ہے مگر حقوق العباد یکسر فراموش کر دیے جاتے ہیں۔ ہم بانگ دہل کہتے ہیں کہ اس میں وہ لوگ کچھ زیادہ ہی ملوث ہیں جو تقویٰ شعاروں کے زمرے میں شامل کیے جاتے ہیں۔ یہ (نام کے) بڑے لوگ اپنے چھوٹوں کی عزتِ نفس کا تو خیال رکھتے نہیں ان سے معافی مانگنا اور انہیں راضی کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ اور اگر بعض لوگ اپنی ہمت سمیٹ کر ایسا کر بھی لیں تو وہ بھی محض رسمی ہوتا ہے اور اپنے 'عجز' کے اشتہار کے لیے ہوتا ہے۔ ان کے دل میں کدورت وبغض کا لاوا پکتا ہی رہتا ہے۔ الا ماشاءاللہ۔

احادیث وروایات میں اس مبارک شب کے بے پناہ فضائل و برکات درج ہیں۔ یہ رات امت محمدیہ کے لیے بہت بڑا انعام ہے۔ اس انعام سے سابقہ امتیں محروم رہیں۔ یقیناً یہ ہمارے پیارے آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا صدقہ ہے جو ہم سب کو میسر ہے۔ یہ امتِ

محمد یہ پر ایک عظیم احسان ہے۔ اس سے جہاں حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عظمتِ شان ظاہر ہوتی ہے وہیں امتِ محمد یہ کی خصوصیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ بڑا کم نصیب ہے وہ مسلمان جو اس مبارک شب کو پائے اور اس کے فیوض و برکات سے غسل نہ کرے۔

شبِ براءت میں ادا کیے گئے نوافل اس وقت تک درجۂ قبولیت کو نہیں پہنچ سکتے جب تک اس کے حقیقی مطالبات کی آواز پر لبیک نہ کہا جائے اور یہ حقیقی مطالبات حقوق العباد کی ادائیگی ہیں۔ وہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں جو شب براءت کی رحمتوں سے جی بھر کر سیراب ہوتے ہیں، خدا کی خوشنودی حاصل کرتے ہیں اور شب براءت کا صحیح استعمال کرتے ہیں اور اس حقیقت کو یاد رکھتے ہیں کہ شب براءت دراصل گناہوں سے نجات کی رات ہے۔

اس مبارک شب کا پس منظر شاید یہ ہے کہ سابقہ امتوں میں بہت سارے لوگوں کی عمریں بہت زیادہ طویل ہوا کرتی تھیں کوئی کوئی تو کئی کئی صدیوں تک زندہ رہتا تھا اور اللہ کی عبادت کرتا تھا۔ اپنے طویل عرصۂ زندگی سے وہ حضرات خدا کی بارگاہ میں درجۂ کمال حاصل کرتے تھے مگر چونکہ امتِ محمد یہ کی عمریں اتنی طویل نہیں ہوتیں کہ وہ بھی ایک لمبے عرصے تک عبادت و ریاضت کر کے اپنے پالنہار کی رضامندی حاصل کر سکیں اس لیے ہم امتِ محمد یہ کو اللہ عزوجل نے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی برکت سے یہ عظیم الشان انعام عطا فرمایا یعنی اس نے ہمیں شب براءت عطا فرما کر ہمیں یہ موقع عنایت فرمایا کہ ہم بھی اس شب میں عبادت و ریاضت کر کے خدا کے مقرب بندے بن سکیں۔ صوفیا کے اقوال کی روشنی میں اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شب براءت میں خلوصِ دل سے ادائیگیِ نوافل و کثرتِ عبادات گزشتہ لوگوں کی صدیوں پر محیط عبادت کے برابر یا ان سے افضل بھی ہوسکتی ہے۔

ہماری عمریں اگر چہ کم ہوتی ہیں مگر شبِ براءت نے ہمیں یہ برکت والا حسین موقع عنایت فرمایا ہے کہ ہماری کم نمازیں بھی ان طویل العمر لوگوں کی نمازوں کے برابر گردانی جائیں **فالحمد للہ علیٰ ذلک**۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ صرف اسی رات کی عبادت سے وہ اللہ کے حضور مقرب ہوسکتا ہے اور امم سابقہ کی صف میں کھڑا ہوسکتا ہے بلکہ شب براءت تو بندوں کے درجات میں بلندی، کمالات میں اضافے اور بندے کو خدا سے قریب کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اسپیشل گفٹ ہے۔ ■

ایک تکلیف دہ صورت حال یہ ہے کہ شب براءت کو ہمارے مسلم نوجوانوں نے سیر و تفریح، مٹر گشتی، پٹاخے بازی اور ہلڑ بازی کا ذریعہ سمجھ لیا ہے جو انتہائی بری بات ہے، اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہمارے ائمۂ مساجد اور ذمے داروں کو اس کے خلاف ایکشن لینا چاہیے۔ ان کے اس عمل سے غیر مسلموں میں غلط فہمیاں پھیلتی ہیں اور اسلام کی شبیہ متاثر ہوتی ہے۔ ہمارے مسلم نوجوانوں نے اس مغفرت والی رات شب براءت کے حوالے سے اپنے عمل و کردار سے غیر شعوری طور پر جو غلط فہمی پھیلائی وہ یہ ہے کہ بہت سارے غیر مسلم یہ سمجھنے لگے ہیں کہ جس رات مسلم نوجوان سڑکوں پر تیزی سے موٹر سائیکل دوڑائیں۔ ایک دوسرے پر بازی مارنے کے لیے گاڑی تیزی سے دوڑاتے ہوئے ماحولیات پر اثر انداز ہوں، گلی کوچوں میں ہلڑ بازی کرتے پھریں، پٹاخے بازی کر کے لوگوں کی عبادت اور نیند میں خلل ڈالیں اور چوراہوں پر گپ شپ کرتے ہوئے نظر آئیں تو سمجھ لو کہ مسلمانوں کی بڑی رات (یعنی شب براءت) آگئی۔ یہ کوئی مفروضہ نہیں بلکہ ایک ذمے دار غیر مسلم کی زبانی سنی ہوئی بات ہے۔ خدارا خدارا ایسی حرکتیں مت کیجیے جس سے اس شب کا تقدس پامال ہو اور اسلام کے چہرے پر داغ آئے۔

ایک بات اور، اس مبارک شب کے حوالے سے ہمارے ہی کچھ بھائیوں میں جو بدقسمتی سے دوسرے عقیدے کے ہیں، اس شب کے متعلق بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ وہ اس شب کے فضائل و برکات کا بڑی سختی سے رد کرتے ہیں اور اسے بے اصل سمجھتے ہیں، ممکن ہے، آپ میں سے بہت سوں کو ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا ہو، ہم میں سے کچھ لوگ اپنی کم علمی اور سادہ لوحی کے باعث ان کی باتوں میں آ بھی جاتے ہیں اور یہ شب ان کی نگاہ میں مشتبہ ہو جاتی ہے۔ ایسے مخالفت کرنے والے لوگ اگر کبھی آپ کو ورغلانے کی کوشش کریں تو آپ جھگڑا کرنے اور ماحول میں تلخی پیدا کیے بغیر ان سے فقط اتنا کہیں کہ جناب! آپ کو نہیں ماننا ہے تو مت مانیے، ہم اس شب میں عبادات کرتے ہیں، تسبیحات کرتے ہیں، اپنے بھائیوں کو راضی کرتے ہیں، اپنے معبود حقیقی کے حضور۔۔۔۔ (بقیہ ص ۴۸ پر)

41

صبر ہی ہمارا درماں ہے

صبر کی تعریف، اقسام، فضیلتوں، برکتوں اور ثمرات ونتائج کا تذکرہ

از: مولانا عظمت اللہ نجمی

اللہ رب العزت نے فطرت انسانی میں بہت ساری چیزیں ودیعت کی ہیں، جن کو انسان محسوس اور غیر محسوس طور پر استعمال کرتا ہے اور انھیں کے ذریعہ پروان چڑھتا ہے، انھی سے کاروانِ حیات چلاتا ہے اور اپنی منزل کی طرف گام زن رہتا ہے۔ انسان فطرۃً یہ چاہتا ہے کہ اس کی زندگی سکون اور چین سے گزرے اور وہ ہمہ وقت راحت و آرام میں رہے، اس کے لیے وہ محنت کرتا ہے، کوشش کرتا ہے، مجاہدہ کرتا ہے اور عبادت وریاضت کرتا ہے۔ انسان ہر وقت اسی امید میں رہتا ہے کہ وہ دنیا میں بھی خوش وخرم رہے اور آخرت میں بھی خطرات سے محفوظ رہے۔ انسان اپنے دھن میں مگن رہتا ہے، اسے کسی بات کا خیال نہیں ہوتا، مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اٹل ہوتا ہے جو نافذ ہو کر رہتا ہے، اللہ کا امر کبھی ٹلتا نہیں، اس کی سنت کبھی بدلتی نہیں۔ میرے رب کا فرمان ہے: **لا تبدیل لکلمات اللہ، لا مبدل لکلماته** اس کی باتیں بدلتی نہیں، اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ اسی وجہ سے مختلف اوقات اور مختلف صورتوں میں انسان پر کوئی غم، کوئی حادثہ، کوئی پریشانی، کوئی رنج، کوئی الم، کوئی تکلیف، کوئی غیر ضروری، غیر مناسب اور غیر متوقع امر پیش آجاتا ہے اور اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا ہے کہ یہ ناقابل برداشت واقعات کبھی رفع درجات، کبھی بدیوں کو نیکیوں میں بدلنے، کبھی آزمائش اور عذاب کے لیے رونما ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں، مسلمانوں اور نیکوکاروں کو ایسے موقع کے لیے ایک عظیم تحفہ صبر عطا کیا ہے۔ صبر کرنے سے بندہ کو دنیا میں راحت اور آخرت میں نعمت سے نوازا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں صبر کی تلقین کرتے ہوئے بے شمار انعامات کا وعدہ کیا ہے، اور اس کا اجر بے حساب بتایا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے صبر کرنے والے کو کرم، سلامتی، اور رحمت کی خوش خبری دی ہے اور فرمایا یہی لوگ فضل والے اور ہدایت یافتہ ہیں اور ان کو بے حساب اجر دیا جائے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِیْنَ الَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِیْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔

(سورۃ البقرۃ:۱۵۵)

ترجمہ: اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور خوشخبری سنا ان صبر والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت پڑے تو کہیں ہم اللہ کے مال ہیں اور ہم کو اسی کی طرف پھرنا یہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی دُرودیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ پر ہیں۔ (کنز الایمان)

اس آیت میں صیغہ تاکید کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ہم تمہیں ضرور بالضرور آزمائیں گے۔ لہٰذا ہر مسلمان، چاہے نیک ہو یا بد ہو، اس آزمائش سے نہیں بچ سکتا۔ اس آزمائش کا مقصد کسی کی نیکی اور بدی جاننا نہیں، کیوں کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے، کیوں کہ وہ تو عالم الغیب والشھادۃ ہے، بلکہ اس کا مقصد اہل ایمان میں شکر گزار بندوں کا مرتبہ اور مقام لوگوں میں ظاہر کرنا اور ناشکروں کی حیرانگی ودرماندگی کو عیاں کرنا ہے، چناں چہ یہ آزمائش صبر کرنے والوں کے لیے رفع درجات اور قرب الٰہی کا ذریعہ بنتی ہے اور بے صبروں کے لیے تکلیف اور اللہ تعالیٰ سے مزید دوری کا ذریعہ بنتی ہے، جو تکلیف اللہ کے قریب کر دے وہ رحمت ہے، جو اللہ سے دور کر دے وہ زحمت ہے۔ آیت کریمہ میں جن خاص چیزوں کو بیان کر کے بتایا گیا کہ ان کے ذریعے آزمائش ہوگی ان کے ساتھ "بشیء" کا لفظ مذکور ہے، یعنی ان چیزوں میں سے بھی تھوڑے سے حصے کی آزمائش ہوگی۔ (تفسیر بیضاوی، البقرہ: ذیل آیت:155) ان میں پہلی چیز "خوف" ہے۔ خوف کا لفظ جامع ہے، جان، مال، عزت، اولاد، ہر چیز کے متعلق اندیشہ پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ "الجوع" بھوک کا امتحان، ضرورت کے باوجود حرام مال سے بچنے، اسباب رزق میں حرام وسائل سے

بجنے، قحط اور تنگی کی ساری صورتیں اس میں آ گئیں۔

وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ: مالی نقصان خواہ تکوینی ہوں، جیسے چوری ہو جانا، آگ لگ جانا وغیرہ یا غیر شرعی معاملات سے دست بردار ہونے کی صورت میں ہو۔ وَالْأَنْفُسِ: جانوں کی کمی، جو قریبی اعزہ کی موت ، بیماری یا جہاد میں شہادت کی شکل میں ظاہر ہو۔ وَالثَّمَرَاتِ: پھلوں میں کمی، اس سے اولاد کی کمی بھی مراد ہو سکتی ہے، نیز پھلوں، زراعت وتجارت میں کمی کی تمام صورتیں اس میں آ گئیں۔

اللہ تعالیٰ نے وضاحت کے ساتھ صبر کی فضیلت اور اہمیت بیان فرمائی۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ۔ (سورۃ البقرۃ ۱۵۳)

ترجمہ: اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد چاہو بیشک اللہ صابروں کے ساتھ ہے۔ (کنز الایمان)

اس آیت کریمہ میں رب تعالیٰ نے ایمان والوں کو حکم فرمایا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی مدد چاہتے ہو تو صبر کا مظاہرہ کرو اور نماز پڑھو۔ اور مزید ارشاد فرمایا: اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ رب کا فرمان یہ نہیں ہے کہ وہ نماز پڑھنے والوں کے ساتھ ہے، اس سے نماز کی فضیلت و اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں ہے، بلکہ نماز کی عظمت اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے ، تاہم صبر کی فضیلت بھی کوئی کم نہیں ہے، اللہ تعالیٰ خود صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور جب بندے کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوگئ تو اس کو نجات اور کامیابی کے لیے کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔

صبر کی ضرورت ہر ایک کو پیش آتی ہے، اس لیے کہ اس دنیا میں جو حالت پیش آتی ہے وہ یا تو انسان کی طبیعت کے موافق ہوتی ہے اس کو راحت کہتے ہیں ایسی صورت میں شکر کا حکم ہے، یا تو انسان کی طبیعت کے خلاف ہوتی ہے اس صورت میں اس کو صبر کرنے کا حکم ہے۔

بے صبری صبر سے مشکل ہے، اس لیے کہ بے صبری میں تھکن بھی ہے اور گناہ بھی ہوتا ہے اور صبر میں راحت و آرام ہے اور ثواب بھی۔ صبر کے مقام پر صبر ہی بہتر چیز ہے، کیوں کہ بے صبری سے مصیبت اور بڑھ جاتی ہے۔ جو صبر کرتا ہے نجات پا لیتا ہے، جو صبر نہیں کرتا وہ خلاصی کا راستہ نہیں پاتا۔ بعض مشائخ فرماتے ہیں صبر میں رحمت کا جلد طلب کرنا، خوشی کا انتظار کرنا، اللہ تعالیٰ سے حسنِ ظن رکھنا اور بغیر حساب کے اجر حاصل کرنا ہے، جب کہ بے صبری اور جزع فزع میں غم کو لانا، بدن کو ہلاک کرنا، ناکامی اور نامرادی کو جلد طلب کرنا، اللہ تعالیٰ پر برا گمان کرنا، گناہوں کو اٹھانا اور عاقبت کا انتظار کرنا ہے، کیا ہی اچھا ہے کہ عقل والے اس سے اجتناب کرتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ کسی بندہ پر کوئی انعام کرتا ہے تو اس کو چھین لیتا ہے اور اس کے بدلہ میں صبر عطا کرتا ہے۔ لیکن جب اللہ صبر کرنے کا بدلہ دیتا ہے تو وہ اس نعمت سے افضل ہوتا ہے جو اس سے چھین لی جاتی ہے اور پھر یہ آیت پڑھی: "اللہ تعالیٰ صابرین کو بغیر حساب کے اجر دیتا ہے"۔ جو صبر کرتا ہے وہ خواہش اور آرزوں کو پا لیتا ہے اور جو شکر کرتا ہے وہ نعمتوں کو خاص کر دیتا ہے۔

صبر کی حقیقت: حبس النفس علیٰ ماتکرہ نفس کو اس چیز پر روکے رکھنا جو نا پسند ہو، پھر صبر کی تین قسمیں ہیں، (۱) **صبر علی الطاعات** (۲) **صبر عن المعاصی** (۳) **صبر علی المصائب**۔

(۱) **صبر علی الطاعات**: نیکی کرنے کا کچھ موقع ہے، مگر طبیعت کچھ بوجھ محسوس کرتی ہے اور یہ معاملہ ہر کسی کے ساتھ ہوتا ہے، مثلاً نماز کے لیے اٹھ کر جانا، وضو کرنا، جماعت میں شریک ہونا، کبھی انتظار کرنا پڑتا ہے، کبھی سردیوں کا موسم ہوتا ہے، کبھی سخت حالات سے گزر رہا ہوتا ہے، ان حالات میں پریشانیوں کو بھول کر مصائب و آلام کو پس پشت ڈال کر رب کے حضور حاضر ہو جانا یہ صبر علی الطاعات کہلاتا ہے یعنی نیکی میں صبر کرنا۔

(۲) **صبر عن المعاصی**: گناہ کا موقع ہے ، گناہ کرنے کو جی چاہتا ہے، ذرائع بھی موجود ہوں، کوئی مانع بھی نہ ہو، اس کے باوجود اپنے آپ کو قابو میں رکھنا، گناہوں سے دور رہنا، رب کا خوف اپنے دل کے اندر ہمیشہ باقی رکھنا، یہ صبر عن المعاصی ہے، مثلاً غیبت کا موقع ہے، بدنظری کا موقع ہے اس حالت میں خود کو روکے رکھے گا تو جہاد کا ثواب ملے گا۔

(۳) **صبر علی المصائب**: عام طور پر اسی کو صبر شمار کیا جاتا ہے مصیبت آئے یا ایسی حالت آئے ، جو مرضی کے خلاف ہو، اس وقت صبر کرنا اور رب کی مشیت پر راضی رہنا، گناہوں سے خود کو محفوظ رکھنا صبر علی المصائب کہلاتا ہے۔

صبر کا تقاضا: صبر کا ایک لازمی تقاضا قرآن مجید سے یہ سامنے آتا ہے کہ جب کسی کی طرف سے برائی سامنے آئے تو اسے نہ صرف برداشت کریں، بلکہ ان کی برائی کے بدلے نیکی سے جواب دیں۔ اگر ہم اس کے برعکس کریں گے تو یہ عمل صبر کے خلاف ہوگا۔ اس لیے کہ ہم یہ جان چکے ہیں کہ صبر صرف یہ نہیں ہے کہ ہم چیخنے چلانے، آہ وفغاں کرنے سے گریز کریں۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے اخلاق اور کردار کی بلندی پر قائم رہیں۔ اور دوسرے اگر برائی کر رہے ہوں تو ہم ان کی نقل میں یا انتقام لینے میں برائی نہ کریں۔ بلکہ کوشش کریں کہ ہم لوگوں کی برائی کا جواب بھلائی سے دیں۔ مزید یہ بات بھی قرآن سے معلوم ہوتی ہے کہ بسا اوقات ایسا کرنا اگر ممکن ہو تو اس موقع پر اپنے مقابل کے ساتھ نیکی کر کے اللہ کی راہ میں خیرات وغیرہ کرنی چاہیے۔ میرے رب کا فرمان ہے: أُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ۔ (سورۃ القصص ۵۴)۔

ترجمہ: ان کو ان کا اجر دوبالا دیا جائے گا بدلہ ان کے صبر کا اور وہ بھلائی سے برائی کو ٹالتے ہیں اور ہمارے دیئے سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ (کنز الایمان)

صبر اور درگزر: صبر کی تکمیل عفو و درگزر کے بغیر نامکمل ہے، اسی وجہ سے قرآن مقدس نے دونوں کو ایک ساتھ بیان کیا ہے: وَلَمَنِ انتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهِ فَأُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِم مِّن سَبِيلٍ إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَظْلِمُونَ النَّاسَ وَيَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَلَمَن صَبَرَ وَغَفَرَ إِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (سورۃ الشوری ۴۳، ۴۲، ۴۱)۔

ترجمہ: اور بے شک جس نے اپنی مظلومی پر بدلہ لیا ان پر کچھ مواخذہ کی راہ نہیں، مواخذہ تو انہیں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی پھیلاتے ہیں ان کے لئے دردناک عذاب ہے، اور بیشک جس نے صبر کیا اور بخش دیا تو یہ ضرور ہمت کے کام ہیں۔ (کنز الایمان)

چنانچہ جب آپ پر کوئی اذیت کسی کی طرف سے آئے تو آپ کے لیے دو راستے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اس آدمی سے انصاف کے مطابق بدلہ لے لیں۔ اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ آپ اسے معاف کر دیں اور اس کی اذیت پر صبر کریں۔ قرآن مجید کے نزدیک یہی دوسرا راستہ بہتر اور پسندیدہ ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صبر سے مراد یہ ہے کہ آپ دوسروں کی ان خطاؤں سے درگزر کریں، جو آپ کے لیے باعث اذیت ونقصان ہیں۔ اگر آپ نے صبر کیا ہے تو معاف کرنا ہوگا۔ ورنہ آپ کا صبر بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ قرآن مجید میں ایسے لوگوں کے بارے میں کہا گیا: وَالَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبٰٓئِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ۔ (سورۃ الشوری: ۳۷)

ترجمہ: اور وہ جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائیوں سے بچتے ہیں اور جب غصہ آئے معاف کر دیتے ہیں۔ (کنز الایمان)

قرآن پاک میں بے شمار مواقع پر رب تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں سے صبر کا مطالبہ فرمایا ہے، ایک عارف باللہ کی جیب میں ہمیشہ ایک رقعہ رہتا تھا، ہمہ وقت وہ اس کو نکال کر دیکھا کرتے تھے، اس رقعہ میں لکھا تھا، وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ (سورۃ الطور ۴۸) ترجمہ: اور اے محبوب! تم اپنے رب کے حکم پر ٹھہرے رہو کہ بیشک تم ہماری نگہداشت میں ہو۔ (کنز الایمان)

صبر سے متعلق احادیث مبارکہ:

(۱) عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ، مِنْ نَصَبٍ وَلاَ وَصَبٍ، وَلاَ هَمٍّ وَلاَ حُزْنٍ وَلاَ أَذًى وَلاَ غَمٍّ، حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا إِلَّا كَفَّرَ اللهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ۔

(صحیح البخاری باب ماجاء فی کفارۃ المرض)

حضرت ابو سعید خدری اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مسلمان جب بھی کسی پریشانی، بیماری، رنج ملال، تکلیف اور غم میں مبتلا ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اسے کانٹا بھی چھبتا ہے تو اللہ تعالی اسے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے۔

(۲) وَعَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُصِبْ مِنْهُ۔

(البخاری باب ماجاء فی کفارۃ المرض)

اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے اس کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔

(بقیہ ص ۱۵ پر)

مشاھدات

اصحاب کہف کے غار میں

۴۱

برصغیر ہندو پاک کے معروف کالم نگار، مصنف اور دانش ور کی ایک مشاہداتی اور معلوماتی تحریر

از: جاوید چودھری

اصحابِ کہف کا غار عمان شہر کے مضافات میں واقع ہے۔ میں نے اتوار (۳مارچ ۲۰۱۸) کے دن اصحاب کہف کے غار پر حاضری دی۔ میں نے وہاں کیا دیکھا ہم اس طرف آنے سے پہلے اصحاب کہف کا پس منظر دیکھیں گے۔

اصحاب کہف رومی بادشاہ ٹروجان کے دور کے لوگ تھے، ٹروجان بت پرست تھا، یہ ۹۸ء سے لے کر ۱۱۷ء تک بادشاہ رہا، ٹروجان کے دور میں عیسائیت پھیل رہی تھی، شہر کے سات نوجوانوں نے عیسائیت قبول کی اور یہ لوگوں کو بت پرستی سے روکنے لگے، بادشاہ کو پتہ چلا، اس نے ان کی گرفتاری کا حکم دے دیا، یہ لوگ دارالحکومت سے بھاگے، پہاڑوں میں پہنچے، مناسب سے غار کا تعین کیا اور یہ غار میں سو گئے، ان کے ساتھ ان کا کتا بھی تھا، کتے نے بھی آنکھیں موند لیں۔

یہ لوگ اگلے دن جاگے تو انھیں بھوک محسوس ہوئی، انھوں نے ایک ساتھی کو چند سکے دے کر کھانا لانے کے لیے قریبی بستی بھجوا دیا، وہ شہر پہنچا، نانبائی سے کھانا لیا، سکے پیش کیے اور نانبائی نے اسے پکڑ لیا، تفتیش ہوئی، پتہ چلا اس نے قدیم زمانے کا لباس پہن رکھا ہے اور اس کے سکے تین سو سال پرانے ہیں، مزید تحقیق ہوئی، معلوم ہوا یہ لوگ غار میں تین سو سال سوئے رہے تھے، بادشاہ کو اطلاع ہوئی، وہ اپنی کابینہ کے ساتھ غار میں پہنچا، باقی اصحاب سے ملاقات ہوئی۔

ثابت ہو گیا یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے تین سو سال گہری نیند میں سوئے رہے، اس دوران پورا علاقہ مشرف بہ عیسائیت ہو چکا تھا' یہ لوگ جس معاشرے کو بت پرست چھوڑ کر سوئے تھے اس میں اب ہر جگہ چرچ بن چکے تھے' بادشاہ نے انھیں شہر تشریف لانے کی دعوت دی لیکن ان حضرات نے انکار کر دیا، وہ اسی غار میں مقیم رہے، طبعی زندگی پوری کی اور انتقال فرما گئے۔

بادشاہ نے ان کی وصیت کے مطابق انھیں اسی غار میں دفن کر دیا اور غار کے اوپر عبادت گاہ بنا دی' ماہرین کے مطابق یہ ۲۵۰ء کا واقعہ ہے، قرآن مجید نے سورۃ الکہف میں اس واقعے کا تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ قرآن مجید نے ان حضرات کو **اصحاب الکھف والرقیم** قرار دیا اور ان کے غار کی تین نشانیاں بیان کیں، یہ غار ایک ایسی جگہ واقع ہے جہاں سورج دائیں جانب سے جھکتا ہوا طلوع ہوتا ہے اور بائیں جانب سے کترا کر غروب ہوتا ہے، اصحاب کہف غار کے کشادہ حصے میں سوئے ہوئے تھے اور اس غار کے اوپر ایک عبادت گاہ (مسجد) ہے۔

قرآن مجید نے ان حضرات کی تعداد بیان نہیں کی، ائمہ کرام کا خیال ہے یہ لوگ تین، پانچ یا سات تھے، عیسائی محققین ان کی تعداد سات بیان کرتے ہیں اور اس مناسبت سے انھیں ''سیون سلیپرز'' کہتے ہیں' قرآن مجید نے انھیں رقیم کا باسی بھی قرار دیا تھا' محققین کا خیال ہے رقیم پیٹرا کا قدیم نام تھا، یہ لوگ پیٹرا سے بھاگ کر عمان پہنچے تاہم عمان سے سو کلومیٹر کے فاصلے پر رجیب نام کی ایک بستی موجود ہے۔

محققین کا خیال ہے یہ رقیم کا بگڑا ہوا نام ہے اور یہ لوگ رجیب سے یہاں آئے تھے غار کے دائیں بائیں موجود آبادی کو بھی رقیم کہا جاتا ہے لیکن یہ وہی رقیم ہے جس کا نام قرآن مجید نے بیان کیا یا پھر یہ رجیب تھا یا پھر یہ پیٹرا تھا، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ دنیا میں اصحاب کہف کے بے شمار غار ہیں' ایک غار ترکی کے شہر افسس (Ephesus) میں بھی موجود ہے' یہ دنیا کے قدیم ترین شہروں میں شمار ہوتا ہے' اس میں حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر بھی موجود ہے۔

حضرت مریم رضی اللہ عنہا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد سینٹ جان کے ساتھ افسس تشریف لے آئی تھیں' آپ نے زندگی کا بڑا حصہ اس شہر میں گزارا تھا' آپ کے دور میں یہ پورا علاقہ عیسائی ہو گیا' لوگوں کا خیال ہے اصحاب کہف کا واقعہ افسس میں پیش آیا' وہاں غار بھی موجود

ہے' ایک غار شام میں بھی واقع ہے اور تیونس اور الجیریا میں بھی ایسے غار ہیں لیکن ہم اگر قرآن مجید کی نشانیوں کی بنیاد پر دیکھیں تو اردن کا غار زیادہ حقیقی محسوس ہوتا ہے، یہ احادیث سے بھی ثابت ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی فرمایا تھا، یہ غار ایلا (خلیج عقبہ) کے قریب واقع ہے' قرآن مجید نے غار کی نشانی بیان کی اس میں ہوا اور روشنی آتی تھی لیکن دھوپ نہیں آتی تھی' دھوپ نہ آنے کی وجہ سے اصحاب کہف کے اجسام نیند کے دوران خراب ہونے سے بچ گئے، اگر ان کے جسموں پر براہ راست دھوپ پڑتی رہتی تو وہ سوکھ جاتے۔

قرآن مجید اور احادیث نے اس کے اوپر عبادت گاہ کا ذکر بھی کیا اور غار کے دروازے کے دونوں اطراف ستونوں کا حوالہ بھی دیا، یہ ساری نشانیاں اردن کے غار میں موجود ہیں چنانچہ یہ زیادہ قرین قیاس محسوس ہوتا ہے، قرآن مجید نے اصحاب کہف کے کتے کا ذکر بھی کیا، اس غار سے کتے کے جبڑے کی ہڈی بھی دریافت ہوئی، یہ بھی بطور سند پیش کی جاتی ہے تاہم صرف اور صرف اللہ بہتر جانتا ہے۔

ہم اتوار تین مارچ کی صبح اصحاب کہف کے غار میں پہنچ گئے' کھنڈرات کے درمیان ایک دروازہ تھا، دروازے کے اندر دو سیڑھیاں تھیں اور یہ سیڑھیاں دو ہال نما کمروں میں کھلتی تھیں' پہلا ہال ڈیوڑھی نما تھا، ڈیوڑھی کے دائیں اور بائیں قبروں کے دو سیٹ تھے، یہ اصحاب کہف کے مزارات تھے' ایک مزار میں درمیانے سائز کا سوراخ تھا، سوراخ پر شیشہ لگا تھا، ہم نے موبائل فون کی لائٹ آن کی تو قبر کے اندر جھانکنے کی کوشش کی۔

گائیڈ کے مطابق پرانے علاقے میں اجتماعی قبریں بنائی جاتی تھیں۔ یہ غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں بھی موجود تھا، تجارتی قافلے یہاں سے گزرتے تھے اور لوگ دعا کے لیے بھی یہاں رکتے تھے، سلطان صلاح الدین ایوبی بھی یہاں آئے تھے' انھوں نے غار کی چھت پر پچی کاری کرائی تھی' پچی کاری کے آثار آج تک موجود ہیں۔

قبروں سے آگے دو سیڑھیاں چڑھ کر ایک دوسرا ہال تھا، یہ وہ جگہ تھی جہاں اصحاب کہف تین سو سال تک سوئے رہے تھے' عرب کا سال قمری کیلنڈر پر مشتمل ہوتا ہے چنانچہ ہم اگر اس زمانے کو شمسی سال میں کنورٹ کر کے دیکھیں تو یہ زمانہ ۳۰۹ سال بنیں گے' ہال کے دائیں ہاتھ پتھر کی ایک انگیٹھی تھی' یہ انگیٹھی یقیناً سردیوں کے موسم میں غار کو گرم رکھنے کے کام آتی ہوگی' میں ہال کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا، میرے سامنے غار کا دہانہ تھا۔

قرآن مجید کے عین مطابق غار میں روشنی آ رہی تھی لیکن دھوپ اندر داخل نہیں ہو رہی تھی' غار کا درجہ حرارت بھی باہر سے مختلف تھا، یہ درجہ حرارت' روشنی اور دھوپ کا اندر داخل نہ ہونا وہ نشانیاں تھیں جن کا قرآن مجید نے ذکر فرمایا، اصحاب کہف کے اجسام تین سو سال تک دھوپ سے بھی محفوظ رہے اور وہ نیند کے دوران کروٹیں بھی بدلتے رہے۔

اصحاب کہف کی داستان پہلی بار ساروغ (عراق کا پرانا نام) کے بشپ جیکب (یعقوب) نے ۵۲۱ء میں لکھی تھی' اس نے ''سیون سلیپرز'' کا سارا قصہ بیان کیا' قریش مکہ نے اپنے دو آدمی نضر بن حارث اور عقبہ بن ابومحیط مدینے کے یہودی علما کے پاس بھیجے' دونوں آدمیوں نے یہودی علما سے پوچھا ''ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ آپ ہماری رہنمائی کریں'' یہودیوں نے ان کو بتایا' آپ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ تین سوال پوچھو۔ ایک' اگلے زمانے کے ان نوجوانوں (اصحاب کہف) کا کیا قصہ تھا؟ دو' وہ کون تھا جس نے پوری دنیا کا چکر لگایا' جو مشرق اور مغرب سے ہو کر آیا اور تیسرا سوال' روح کی ماہیت کیا ہے (بعض علما کے مطابق تیسرا سوال حضرت موسیٰ اور خضر علیہما السلام کے متعلق تھا' قرآن کے مطالعے سے بھی یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے) یہودی علما نے کہا اگر محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) بتا دیں تو انھیں نبی مان کر ان کی اتباع کرو اور اگر نہ بتا سکیں تو وہ شخص جھوٹا ہے جو چاہو کرو۔ چنانچہ یہ آپ کے پاس آئے اور تینوں سوالات کیے۔

آپ نے انھیں جواب دیا میں کل ان کا جواب دوں گا لیکن پندرہ دن گزر گئے' وحی نازل نہ ہوئی' اہل مکہ خوش ہو گئے' اور آپ غمزدہ ہو گئے۔ ۱۵ دن بعد جبرائیل علیہ السلام سورۃ الکہف کی آیات لے کر آ گئے جن میں تینوں سوالوں کے جواب تھے اور آپ کو ان شاء اللہ کہنے کی ہدایت بھی فرمائی یوں آپ نے اصحاب کہف کی وہ تمام تفاصیل بھی بیان فرما دیں جو بشپ جیکب کی تحریر میں موجود تھیں اور نہ ہی عیسائی ان سے واقف تھے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم کی سچائی کی تصدیق فرما دی۔ اصحاب کہف کا یہ غار سلطان صلاح الدین ایوبی کے بعد گم ہو گیا' یہ ۱۹۶۱ء میں دوبارہ ظاہر ہوا' کھدائیاں ہوئیں اور یہ عوام کے لیے کھول دیا گیا۔

میں سیڑھیوں پر بیٹھا تھا اور وقت کی کتاب میرے سامنے کھلی پڑی تھی' وہ لوگ کہاں سے بھاگ کر کہاں آئے' اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان پر گہری نیند طاری فرمائی' وہ کس طرح دوبارہ بیدار ہوئے' وہ کس طرح شہر گئے' لوگوں نے کس طرح ان کے ہاتھ چومے' انھوں نے کس طرح طبعی زندگی پوری کی' وہ کس طرح دوبارہ فوت ہوئے۔

یہ غار کس طرح بار بار انسانی آنکھوں سے اوجھل ہوتا اور ظاہر ہوتا رہا اور میں کس طرح ہزاروں میل کا سفر طے کر کے اللہ تعالیٰ کے ان متبرک بندوں کی زیارت کے لیے یہاں پہنچا' وقت کے سارے صفحے چند سیکنڈ میں میری نظروں کے سامنے سے گزر گئے' میں نے دل ہی دل میں دہرایا'' اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے'' توبہ کی' شکر ادا کیا اور اٹھ کر باہر آ گیا' باہر سورج اپنی پوری حدت کے ساتھ چمک رہا تھا۔

●●

مفتی شفیق الرحمن عزیزی مصباحی کو ہالینڈ کا چیف قاضی بنائے جانے پر مبارک باد

حضرت مولانا مفتی شفیق الرحمن عزیزی مصباحی کو ابھی حال ہی میں نیدرلینڈ کا چیف قاضی مقرر کیا گیا ہے۔ وہ برسوں سے نیدرلینڈ میں قیام پذیر ہیں اور مختلف ممالک میں وعظ وخطابت کے لیے تشریف لے جاتے ہیں۔ مولانا محمد شفیق الرحمٰن عزیزی مصباحی ضلع بستی کے مشہور ومعروف گاؤں جمداشاہی کے رہنے والے ہیں۔ یہ وہی بستی ہے جہاں مبلغ اسلام خلیفہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قدس سرہ کی طرف منسوب ادارہ دارالعلوم علیمیہ قائم ہے، دارالعلوم علیمیہ اپنی دینی وعلمی خدمات کے باعث محتاج تعارف نہیں۔ مولانا عزیزی نے ابتدائی تعلیم علیمیہ میں حاصل کی پھر جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں داخلہ لیا جہاں سے فضیلت کی تعلیم مکمل کی پھر شارح بخاری حضرت علامہ مفتی شریف الحق امجدی علیہ الرحمہ اور محدث کبیر حضرت علامہ ضیاء المصطفی دام ظلہ العالی کی تحریک وارشاد پر جامعہ اشرفیہ ہی سے تحقیق فی الفقہ والافتاء کا کورس مکمل کیا۔ حضرت شارح بخاری کے حکم پر دارالعلوم اظہار العلوم جہاں گیر گنج میں عالیہ کے مدرس مقرر ہوئے۔ ۶ ماہ کے بعد ممبئ عظمیٰ کی مشہور وقدیم دینی درس گاہ دارالعلوم محمدیہ متصل مینارہ مسجد میں بحیثیت مفتی ومدرس آپ کی تقرری عمل میں آئی، یہاں رہ کر آپ ناریل واڑی مسجد میں امامت وخطابت کے ذریعہ دینی خدمات انجام دیتے رہے۔ چند سالوں کے بعد ممباسہ کینیا مشرقی افریقہ میں ایک عالم کی ضرورت ہوئی تو حضور اشرف العلماء حضرت سید الشاہ حامد اشرف الاشرفی الجیلانی ودیگر اساتذہ کی نگاہ انتخاب آپ پر پڑی۔ اس طرح آپ ممباسہ کینیا پہنچے، آپ نے وہاں پہنچ کر اپنی دینی خدمات کا آغاز کیا، اہل سنت وجماعت کو متحد ومنظم کیا اور پانچ سال کام کرنے کے بعد دارالعلوم برکات مصطفیٰ قائم کیا۔ اس ادارے کے قیام میں مشرقی افریقہ کے علماومشائخ بالخصوص شیخ افریقہ سید احمد طہٰ شریف الحداد اور حضرت پیر شاہ باوا علامہ سید احمد دامت برکاتہ مفتی کچھ کا بڑا عمل دخل اور تعاون حاصل رہا۔ اسی دوران شہزادہ مبلغ اسلام حضرت علامہ الشاہ احمد نورانی صدیقی علیہ الرحمہ ورلڈ اسلامک مشن نیدرلینڈ آنے کا حکم فرمایا۔ آپ کے حکم کی تعمیل میں نیدرلینڈ حاضر ہوئے، اب یہاں قریب پچیس سالوں سے مختلف الجہات دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

آپ ایک سنجیدہ اور باشعور عالم وداعی دین ہیں۔ آپ ہالینڈ میں ورلڈ اسلامک مشن کے کنوینر اور مسجد طیبہ ایمسٹرڈم کے خطیب وامام ہیں۔ جامعہ مدینۃ الاسلام دین ہاگ میں استاذ حدیث اور رویت ہلال کمیٹی نیدرلینڈ کے چیئرمین بھی ہیں۔ قائد اہل سنت حضرت علامہ الشاہ احمد نورانی علیہ الرحمہ اور مفکر اسلام علامہ قمر الزماں خاں اعظمی کی معیت میں ۳۰ رسے زائد یوروپی ممالک کے دعوتی وتبلیغی اسفار کا موقع ملا۔ ۲۶ سالہ دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں ۱۰۰ سے زائد غیر مسلم دامن اسلام میں داخل ہوئے۔ آپ کی کاوشوں سے کئی نمایاں دینی کام ہوئے جس میں ۱۹۹۲ میں مبلغ اسلام کانفرنس ایمسٹرڈم، ۱۹۹۹ میں بین الاقوامی ختم نبوت کانفرنس ایمسٹرڈم، ۲۰۰۲ میں ختم نبوت کانفرنس دی ہیگ ہالینڈ سرفہرست ہیں۔

حضرت مولانا موصوف کو نیدرلینڈ کا چیف قاضی اور صدر مفتی کا پروقار عہدہ تفویض کیے جانے پر تحریک سنی دعوت اسلامی انہیں مبارک باد پیش کرتی ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ پاک آپ کو دین وسنیت کی مزید خدمات کی توفیق بخشے۔ (ادارہ)

عظیم مائیں

اُمہات المومنین کی بے مثال انجمن

دنیا کی ان عظیم ترین خواتین کرام کا تذکرۂ جمیل کہ ان کے جیسا کوئی پیدا ہوا ہے اور نہ ہوگا

از: ڈاکٹر محی الدین غازی

جب ہم خیر اُمت کی تاریخ کے روشن صفحات پر نظر ڈالتے ہیں تو اُمہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن اجمعین کے حوالے سے بہت دل کش منظر سامنے آتا ہے۔ یہ منظر بتاتا ہے کہ اُمہات المومنین میں آپس میں جس قدر الفت و محبت تھی، اس کی نظیر سگی بہنوں میں بھی کہاں ملتی ہوگی؟ اُمہات المومنین کی باہمی اخوت کو ایمانی اخوت کی بہترین مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اُمہات المومنین کے گھروں میں کتاب وحکمت کا خوب خوب چرچا رہتا تھا اور اس کی برکت سے ان کی زندگی روشن سے روشن تر ہوتی جاتی تھی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے فیض سے ان کی سیرت شاہ کار بن گئی تھی، ان کے دل کدورتوں سے پاک اور ان کی زبانیں بے اعتدالی سے دُور تھیں۔ ایسی پاک بی بیوں کے بے مثال باہمی تعلقات کی مکمل عکاسی پیش کرنا نہ راویوں سے ممکن تھا اور نہ وہ کر سکے، بس کچھ جھلکیاں روایتوں کے ریکارڈ میں محفوظ ہو گئیں۔ انھی جھلکیوں سے بہت کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اُمہات المومنین کی باہمی قربت نے ایک مثالی انجمن (یہاں لفظ 'انجمن' سے مراد کوئی پارٹی نہیں بلکہ 'ہم نشینی' اور 'مشارکت' ہے) کی صورت اختیار کر لی تھی، اور اس انجمن کے اندر ہر وقت بے لوث محبت، سچّی دوستی اور حقیقی خیر خواہی کا دور دورہ رہتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی بہت قریبی سہیلیاں تھیں۔ ان کا آپس میں جتنا گہرا تعلق تھا، اتنا گہرا تعلق اپنی دوسری رشتے دار خواتین سے بھی نہیں تھا۔ وہ ایک دوسرے کی دم ساز اور ہم راز تھیں۔ وہ جب اپنی 'سوتن' (ضَرَّۃٌ، ہم سر) کا ذکر کرتیں تو صَوَاحِبِی کا لفظ استعمال کرتیں، یعنی سہیلیاں اور ہم جولیاں۔ اس انجمن کی مستقل ملاقاتیں اور نشستیں ہوا کرتی تھیں۔ کبھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب کی نشست ہوتی تھی، تو کبھی آپ کی عدم موجودگی میں بھی۔ انھیں اللہ کے رسول کے سامنے اپنا کوئی مشترکہ مسئلہ رکھنا ہوتا تھا، تو پہلے وہ آپس میں مشورہ بھی کر لیا کرتی تھیں، اور پھر آپس ہی میں اپنا ایک نمایندہ طے کر کے اسے اللہ کے رسول کے پاس بھیجتی تھیں، کہ وہ سب کی طرف سے عرض داشت پیش کرے۔ ایک بار انھوں نے حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہ کو اپنا نمایندہ بنا کر بھیجا، ان کے الفاظ ہیں: كَلَّمَنِي صَوَاحِبِي أَنْ أُكَلِّمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ (مسند احمد)، میری سہیلیوں نے مجھ سے کہا کہ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے (ایک مسئلے میں) بات کروں۔

اس بے مثال انجمن کی نشستیں اللہ کے رسول کے ساتھ روزانہ شام کو باری باری سب کے گھر میں ہوا کرتی تھیں: فَكُنَّ يَجْتَمِعْنَ كُلَّ لَيْلَةٍ فِي بَيْتِ الَّتِي يَأْتِيهَا (مسلم: باب القسم بین الزوجات، حدیث: ۲۷۳۴)۔ وہ بادل ناخواستہ محض اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں اپنی سوتن کے گھر جمع نہیں ہوتی تھیں۔ امام نووی کہتے ہیں کہ وہ سب خوشی اور رضامندی سے اپنی کسی ایک ہم سر کے گھر جمع ہو جایا کرتی تھیں: هٰذَا الْاِجْتِمَاعُ كَانَ بِرِضَاهُنَّ (شرح نووی)

جب اُمہات المومنین کی اس انجمن میں کسی نئی رکن کا اضافہ ہوتا تو سب اس کا گرم جوشی سے پرتپاک خیر مقدم کرتیں، اور اپنے اچھے جذبات اور نیک تمناؤں کا اظہار کرتیں۔ اُم المومنین حضرت زینب بنت جحش آپ کے نکاح میں آتی ہیں، نان گوشت کا ولیمہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد راوی کے بقول: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایک کر کے تمام بیویوں کے حجروں میں تشریف لے جاتے ہیں، اور سب بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ کہہ کر خیر وبرکت کی دعائیں دیتی ہیں (بخاری، مسلم)۔ امام قرطبی اس منظر سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں: سوتن کی آمد پر ان کا یہ انداز بیان بتاتا ہے کہ ان کی سوچ کتنی بلند تھی، ان کا ظرف کتنا بڑا تھا، ان کا ساتھ رہ کر جینے کا سلیقہ کتنا عمدہ تھا، ورنہ یہ تو سوتنوں کے لیے آپے سے باہر ہو جانے اور پاس ولحاظ بھول جانے کا موقع ہوتا ہے، لیکن وہ تو بہترین انسان کی بہترین بیویاں تھیں: وَصُدُوْرُ مِثْلِ هٰذَا الْكَلَامِ عَنْهُنَّ فِي حَالِ اِبْتِدَاءِ اِخْتِصَاصِ الضَّرَةِ الدَّاخِلَةِ بِهٖ، يَدُلُّ عَلٰى قُوَّةِ عُقُوْلِهِنَّ وَصَبْرِهِنَّ وَحُسْنِ مُعَاشَرَتِهِنَّ وَاِلَّا فَهٰذَا مَوْضِعُ الطَّيْشِ وَالْخِفَّةِ لِلضَّرَائِرِ، لٰكِنَّهُنَّ طَيِّبَاتٌ لِطَيِّبٍ (المفہم: کتاب النکاح، باب تزویج النبی زینب)

اُمہات المومنین کی آپس میں کس قدر محبت اور بے تکلفی ہوا کرتی تھی، اس کا ایک واقعہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی زبانی سنیے:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ ان کے ایک طرف حضرت سودہ بیٹھی تھیں۔ میں آپ کے لیے خزیرہ (ایک سالن) بنا کر لائی۔ میں نے سودہ سے کہا، تم بھی کھاؤ۔ سودہ نے کہا: مجھے خواہش نہیں ہے۔ میں نے کہا: کھاؤ، ورنہ ابھی یہ تمھارے منہ پر مل دوں گی۔ سودہ نے نہیں کھایا تو میں نے اپنے ہاتھ میں سالن لگایا اور ان کے چہرے پر مل دیا۔ آپ دیکھ کر مسکرا دیے، پھر آپ نے سودہ کے ہاتھ میں سالن لگایا اور کہا تم عائشہ کے چہرے پر مل دو۔ اس کے بعد پھر آپ ہنسنے لگے۔ اتنے میں باہر سے حضرت عمر کی آواز سنائی دی۔ آپ کو خیال ہوا شاید وہ ملاقات کرنے آئے ہیں۔ آپ نے دونوں سے کہا: اٹھو جلدی سے اپنا منہ دھولو۔ (مسند ابی یعلی)۔ اس واقعے سے اُمہات المومنین کے درمیان جو محبت، اپنائیت، بے تکلفی اور صاف دلی جھلک رہی ہے، وہ نہایت دل کش اور بے نظیر ہے۔

ازواج مطہرات کی اپنے شوہر سے محبت اور اپنی سوتنوں کے سلسلے میں کشادہ ظرفی کا عالم یہ تھا کہ اپنے کسی بھی حق سے خوشی خوشی دست بردار ہوجایا کرتی تھیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب بیمار ہوئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لیے مشکل ہوگیا کہ ایک ایک دن سب کے یہاں گزاریں۔ آپ نے سب سے اجازت لی کہ آپ کی تیمارداری حضرت عائشہ کے یہاں رہ کر ہو۔ اس موقعے پر تمام ازواج خوش دلی سے راضی ہوگئیں۔ (بخاری: کتاب الطب، باب اللدود، حدیث: ۵۳۹۲)

اس موقعے سے حضرت عائشہ کے حجرے کو تیمارداری کا شرف حاصل ہوا لیکن کوئی افسردہ خاطر ہوکر اپنے گھر نہیں بیٹھی، تمام ازواج فراخ دلی کے ساتھ آپ کے پاس حاضر رہیں اور مل جل کر آپ کی خدمت اور عیادت میں لگی رہیں۔ حضرت عائشہ کے الفاظ ہیں: ہم اللہ کے رسول کی بیویاں سب کی سب آپ کے پاس تھیں، ہم میں سے کوئی ایک بھی وہاں سے ہٹی نہیں تھی: اِنَّا كُنَّا أَزْوَاجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَهُ جَمِيْعًا، لَمْ تُغَادِرْ مِنَّا وَاحِدَةٌ۔ (بخاری: کتاب الاستئذان، حدیث: ۵۹۳۷)

اُمہات المومنین کی اس انجمن میں ایک دوسرے کو تحفے تحائف بھیجنے کا بھی خاص اہتمام رہتا تھا۔ کسی کے یہاں کوئی مزے دار چیز تیار ہوتی تو وہ بڑے اہتمام کے ساتھ دوسری ازواج کے گھر بھیجا کرتیں: كُنَّ أَزْوَاجُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَهَادَيْنَ الْجَرَادَ عَلَى الْأَطْبَاقِ (سنن ابن ماجہ: کتاب الصید، باب صید الحیتان، حدیث: ۳۲۱۸)

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک بیویوں میں آپس میں اس قدر دل داری اور غم خواری تھی کہ اگر آپ کسی ایک سے ناراض ہوجاتے تو دوسری اس پر خوش ہونے کے بجائے آپ کی ناراضی دُور کرنے کی کوشش کرتی۔ ایک بار آپ کو حضرت صفیہ سے کچھ ناراضی ہوگئی۔ اس دن حضرت صفیہ کے یہاں آپ کے رہنے کی باری تھی۔ حضرت صفیہ حضرت عائشہ کے پاس آئیں اور کہا کہ میری آج کی باری تم لے لو اور میرے سلسلے میں اللہ کے رسول کی ناراضی دُور کرنے کی کوشش کرو۔ حضرت عائشہ تیار ہوگئیں، حضرت صفیہ کی اوڑھنی اوڑھی اور آپ کے پاس جا کر بیٹھ گئیں۔ آپ نے دیکھ کر فرمایا: 'تم یہاں سے جاؤ آج تمھارا دن نہیں ہے'۔ حضرت عائشہ نے کہا: یہ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اس کے بعد پوری بات بتائی تو اللہ کے رسول کی ناراضی دور ہوگئی اور آپ حضرت صفیہ سے راضی ہوگئے۔ (سنن ابن ماجہ: کتاب النکاح، باب المرأة، تھَبُ یومھا لصاحبتھا، حدیث: ۱۹۶۹)

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد بھی اُمہات المومنین کی یہ انجمن اپنی وحدت و اُلفت کے ساتھ برقرار رہی، ان کی باہمی نشستیں اور مشاورتیں جاری رہیں۔ وہ گاہے گاہے کسی ایک کے گھر جمع ہوجایا کرتی تھیں (مستدرک: حاکم)۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں انھوں نے جمع ہوکر مشورہ کیا اور تجویز رکھی کہ حضرت عثمان کو حضرت ابوبکر کے پاس بھیجیں، اس مطالبے کے ساتھ کہ مالِ فے میں سے آٹھواں حصہ انھیں دیا جائے۔ حضرت عائشہ نے اس تجویز سے اختلاف کیا اور کہا کہ آپ کی ہدایت کے مطابق ہمارا اس میں کوئی حصہ نہیں بنتا ہے۔ حضرت عائشہ کی اس بات سے سب کو اطمینان ہوگیا اور انھوں نے اپنا مطالبہ واپس لے لیا۔ (بخاری شریف)

اُمہات المومنین کی یہ بے مثال انجمن بہت سی دینی اور سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ سب بی بیاں مل کر باہم مشورے سے ایک فیصلہ کرلیتی تھیں اور پھر مل کر اسے انجام دیتی تھیں۔ جنگ کی نازک اور پرخطر حالت میں وہ سب مل کر نکلتیں اور مشکیزوں میں پانی بھر بھر کر لاتیں اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیارے ساتھیوں کو پانی پلاتیں: عَنْ أَنَسٍ أَنَّ أَزْوَاجَ النَّبِيِّ كُنَّ يُدْلِجْنَ بِالْقِرَبِ، يَسْقِيْنَ أَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ (مسند ابی یعلی:

حدیث:۳۳۰۰)

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواج مطہرات نے مل کر فیصلہ کیا اور پیغام بھیجا کہ جنازے کو مسجد کے اندر سے گزاریں، وہ ان کی نماز جنازہ پڑھیں گی اور پھر ایسا ہی کیا گیا۔ ان کے حجروں کے سامنے جنازہ رکھ دیا گیا اور انھوں نے نماز جنازہ ادا کرلی۔ بعد میں انھیں معلوم ہوا کہ کچھ لوگ نکتہ چینی کررہے ہیں کہ مسجد میں جنازہ کیوں لایا گیا۔ اس پر حضرت عائشہ نے ان نکتہ چینیوں کا جواب دیا اور کہا کہ: ''لوگ جانے بغیر نکتہ چینی کرنے میں جلد بازی کیوں کرتے ہیں؟ یہ حضرات مسجد سے جنازہ گزارنے کو لے کر ہم پر تنقید کررہے ہیں، حالانکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سہیل ابن بیضاء کی نماز جنازہ مسجد کے اندر ہی ادا فرمائی تھی''۔ (مؤطا امام مالک: کتاب الجنائز، باب الصلاۃ علی الجنائز فی المسجد، حدیث:۵۴۰)

اس انجمن کا ایک اہم کام یہ تھا کہ لوگوں کو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی سنتوں سے واقف کرائیں۔ چنانچہ لوگ آتے تھے اور اُمہات المومنین سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معمولات اور طریقۂ زندگی کے بارے میں پوچھا کرتے تھے اور اُمہات المومنین بلا مبالغہ سنت کی صحیح تصویر پیش کرتی تھیں۔ غلو پسند لوگوں کو بسا اوقات صحیح تصویر نہیں بھاتی تھی۔ تاہم اُمہات المومنین اپنی ذمہ داری بالکل صحیح صحیح انجام دیتی تھیں۔

اس انجمن کا ایک اہم کام یہ بھی تھا کہ اگر کسی گھر کی معاشرتی صورتِ حال اصلاح طلب ہوتو اس کی اصلاح کی جائے۔ اس سلسلے میں اَزواج مطہرات اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو باخبر کیا کرتی تھیں۔ عثمان بن مظعون کی بیوی کے ذریعے معلوم ہوا کہ ان کے شوہر نے پرہیزگاری اور عبادت گزاری کی شدتِ شوق میں اہل خانہ سے یکسر بے توجہی اختیار کررکھی ہے تو اللہ کے رسول کو بتایا اور اللہ کے رسول نے انھیں راہ اعتدال کی تعلیم دی۔ شیطان کے بہکاوے میں آکر بہت سے مرد وخواتین گھروں کو بگاڑنے اور خاندانوں کو توڑنے میں پیش پیش رہتے ہیں۔ یہ اللہ کی نیک بندیاں خود بھی بے مثال اُلفت ومحبت کے ساتھ رہتی تھیں اور دوسرے خاندانوں میں اُلفت ومحبت کی فضا استوار کرنے کے لیے بھی کوشاں رہتی تھیں۔

ازواج مطہرات کے درمیان اس میں تو مقابلہ ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ سے زیادہ خوش رکھنا چاہتی تھیں، تاہم مسابقت کا یہ اعلیٰ جذبہ رقابت ومنافرت کے پست جذبات کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیتا تھا۔ وہ اس مقابلے کے دوران میں بھی ایک دوسرے کے لیے بے پناہ خیرخواہی کے جذبات سے لبریز رہتی تھیں اور ایک دوسرے کے فضل ومرتبے کی بھرپور قدر کرتی تھیں اور کھل کر اس کا اعتراف بھی کرتی تھیں۔

ایک نازک موقعے پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب بنت جحش سے پوچھا کہ: عائشہ کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ انھوں نے کہا: میری سماعت وبصارت کی خیر ہے، اللہ کی قسم! میں نے ان کے اندر بھلائی دیکھی ہے اور صرف بھلائی دیکھی ہے، بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا: وَاللّٰہِ مَا عَلِمْتُ اِلَّا خَیرًا (بخاری: کتاب المغازی، باب حدیث الافک، حدیث:۳۹۲۵)

دوسری طرف حضرت عائشہ بھی حضرت زینب کے بارے میں کھل کر اعتراف کرتی ہیں: میں نے دین داری میں، خدا ترسی میں، صاف گوئی میں، صلہ رحمی میں، صدقہ وخیرات اور اللہ سے قریب ہونے کی خاطر خود کو فنا کردینے میں زینب سے بڑھ کر کوئی خاتون نہیں پائی۔ (مسلم شریف)

قدر ومنزلت اور فضل ومرتبت کے اعتراف کی آخری بلندی یہ ہے کہ ایک بی بی کو اپنی سوتن کے اندر ذرّہ برابر برائی نظر نہیں آتی ہے، بس اچھائی ہی اچھائی نظر آتی ہے اور دوسری بی بی کو ساری دنیا کی عورتوں میں اپنی سوتن کی نظیر نظر نہیں آتی ہے۔ اور دونوں ہی اپنے احساسات کا کھل کر اظہار کرتی ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ سیرت وکردار نہایت بلند ہوں، اور دل ودماغ بالکل پاک وصاف ہوں۔ اُمہات المومنین کی پوری انجمن ایسی ہی بلندیوں پر فائز تھی۔

حضرت جویریہ کے بارے میں حضرت عائشہ کا اعتراف بھی قابل قدر ہے، فرماتی ہیں: ہم نے ایسی کوئی عورت نہیں دیکھی جو اپنی قوم کے لیے جویریہ سے بڑھ کر بابرکت ثابت ہوئی ہو۔ ان کی خاطر بنو مصطلق کے سو خاندان آزاد کردیے گئے: فَمَا رَأَینَا اِمْرَأَۃً کَانَتْ أَعْظَمَ بَرَکَۃً عَلٰی قَوْمِهَا مِنْهَا، أُعْتِقَ فِیْ سَبَبِهَا مِائَۃُ أَهْلِ بِیتٍ مِنْ بَنِیْ الْمُصْطَلِقِ (سنن ابی داؤد: کتاب العتق، باب فی بیع المکاتب، اذا فسخت الکتابۃ، حدیث:۳۴۴۷)

ازواج مطہرات میں حضرت سودہ اور حضرت عائشہ کا ساتھ سب سے پرانا تھا۔ اس طویل صحبت نے ایک دوسرے کی خوشی اور قدر شناسی میں اضافہ ہی کیا۔ حضرت عائشہ، حضرت سودہ کی تعریف

کرنے میں بہت فیاض تھیں۔فرماتی تھیں: تیزمزاج عورتوں میں اگر کسی کے جیسے بننے کی خواہش میرے دل میں ہےتو وہ سودہ ہیں۔ان کی جیسی اچھی تیزمزاج عورت میں نے نہیں دیکھی: مَا رَأَيْتُ امْرَأَةً أَحَبَّ اِلَيَّ أَنْ أَكُوْنَ فِيْ مِسْلَاخِهَا مِنْ سَوْدَةَ بِنْتِ زَمْعَةَ مِنْ امْرَأَةٍ فِيْهَا حِدَّةٌ (مسلم: کتاب الرضاع، حدیث: ۲۷۴۵)۔عورت تیز مزاج بھی ہو، اوراپنی سوتن کی بے حدمحبوب ودل عزیز بھی بن جائے، یہ سیرت وکردار کی حددرجہ بلندی کی علامت ہے۔

حضرت عائشہ، حضرت میمونہ کی عظمت ومنزلت کا اعتراف بھی پوری فراخ دلی سے کرتیں۔ایک موقعے پرفرمایا: ہمارے درمیان وہ سب سے بڑھ کراللہ سے ڈرنے والی اوررشتوں کا حق ادا کرنے والی تھیں۔(مستدرک حاکم)

ازواج مطہرات کی کوشش تو یہی رہتی تھی کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہیں اور ساری دنیا کے سامنے اُلفت ومحبت کا ایک بہترین نمونہ قائم کریں، اور وہ اس کوشش میں ہرطرح سے کامیاب بھی تھیں۔اس کے باوجود ان کو یہ فکر ستاتی تھی کہ کہیں ان کی طرف سے کسی کے ساتھ کوتاہی تونہیں ہوگئی؟

حضرت اُم حبیبہ کا جب آخری وقت آیا توحضرت عائشہ کوبلوایا، اوران سے کہا: ہوسکتا ہے ہمارے درمیان کوئی ایسی بات ہوگئی ہو، جو سوتنوں کے درمیان ہوجایا کرتی ہے۔اللہ ہم دونوں کومعاف کرے۔ حضرت عائشہ نے بھی اسی طرح کے جذبات کا اظہارکیا، اس پرانھوں نے کہا: عائشہ تم نے مجھے خوش کردیا، اللہ تمھیں خوش کرے، سَرَّرْتِنِيْ سَرَّكِ اللهُ۔اس کے بعدانھوں نے حضرت اُم سلمہ کوبلوایا اوران کے سامنے بھی اسی طرح اپنے جذبات کا اظہارکیا۔(طبقات ابن سعد)

ان پاک بی بیوں کا آپس میں کیسا گہراقلبی تعلق تھا کہ آخری وقت میں بھی سب سے زیادہ انھی کا خیال رہتا، اوران کوراضی کرنے اوران سے اپنی غلطیاں معاف کرانے کی فکر رہتی۔

ازواج مطہرات میں آپس میں کتنی بے تکلفی تھی، اور ایک دوسرے کے لیے ان کے دل میں کیسے نیک جذبات رہا کرتے تھے، اس کی ایک مثال حضرت عائشہ خود بیان کرتی ہیں: 'ایک بار اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سب سے پہلے مجھ سے وہ آکر ملے گی، جس کے ہاتھ سب سے لمبے ہیں۔یہ سننا تھا کہ وہ آپس میں ہاتھ ناپنے لگیں، کہ کس کا ہاتھ سب سے لمبا ہے۔بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سعادت حضرت زینب کے حصے میں آئی۔وہ اپنے کام خود کیا کرتی تھیں اورصدقہ وخیرات میں سب سے پیش پیش رہتی تھیں۔(مسلم)

ایک اور روایت میں حضرت عائشہ کے الفاظ اس طرح ہیں: آپ کی وفات کے بعد جب بھی ہم سب کسی ایک کے گھر میں جمع ہوتے تو دیوار پراپنے ہاتھ ناپتے۔ہم ایسا کرتے ہی رہے، یہاں تک کہ زینب کی وفات ہوگئی تو ہم نے جانا کہ لمبے ہاتھ سے مراد صدقہ وخیرات میں آگے بڑھ جانا ہے(مستدرک حاکم)۔ ایک دوسرے سے ہاتھ کی لمبائی میں مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بےتکلفی اورقربت درکار ہے، جوان کے درمیان خوب تھی۔

اُمہات المومنین کی یہ انجمن اپنے علمی تفوق اورامتیاز کے لیے بھی سب کے نزدیک معروف تھی۔مشکل مسائل میں لوگ ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔ایک مسئلہ درپیش ہوا توحضرت علی نے فرمایا: اس بارے میں سب سے زیادہ علم پیارے نبی کی ازواج کے پاس ہے: اِنَّ أَعْلَمَ النَّاسِ بِهٰذَا أَزْوَاجُ النَّبِي (مسند احمد: حدیث ۲۰۶۱۷)۔

ایک اور موقعے پر حضرت ابن عمراورحضرت ابوہریرہ نے کہا ازواج مطہرات اس بارے میں زیادہ جانتی ہیں: أَزْوَاجُ النَّبِيِّ أَعْلَمُ بِذٰلِكَ (مسند احمد، حدیث: ۲۰۶۱۷)۔حضرت زینب کا انتقال ہوا توحضرت عمر نے ازواج مطہرات کے یہاں سوال بھیجا کہ انھیں قبر میں کون اتارے؟ (مسند بزار)۔ازواج مطہرات کے معمولات اور ان کے کاموں کو دیگرلوگ حوالے کےطور پر بیان کیا کرتے تھے: اِنَّ أَزْوَاجُ النَّبِيِّ كُنَّ يَخْتَضِبْنَ بَعْدَ الْعِشَاءِ الْاٰخِرَةِ اِلَى الصَّبحِ (مصنف عبدالرزاق: باب الزينة يوم العيد، حدیث: ۵۶۷۱)

اُمہات المومنین کے باہمی تعلقات پر لکھنے والے بالخصوص زیادہ تر مغربی یا مغرب زدہ مصنّفین ان کی باہمی رقابت کوتلاش کرنے پرزور لگاتے ہیں۔اوراس طرح یہ ایک اصول متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ باہمی رقابت سوتنوں کی فطرت میں شامل ہے اوراس کے اثراتِ بد سے کوئی عورت محفوظ نہیں رہ سکتی ہے، خواہ وہ کیسی ہی دین داراور پرہیزگار ہو۔ایسی افسانہ طرازی کے نتیجے میں اُمہات المومنین کی باہمی رقابت کے بعض قصے اتنے مشہور ہوئے کہ اُمہات المومنین کی باہمی محبت کی تصویر ذہنوں سے اوجھل ہوگئی۔اس لیے حقیقی معنوں میں حسین وجمیل تصویر کوعام اورمشہور کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہوئے ازواج مطہرات کی باہمی رقابت والی کوئی تصویر سامنے نہیں آتی ہے۔چند مواقع پر ایسا تو لگتا

ہے کہ ازواج مطہرات نے کبھی آپس میں ہم آواز ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی پسند ناپسند کے لیے اصرار کرنے کی کوشش کی ہو۔ آپ کے کسی راز پر آپس میں بات کر لی ہو۔ کسی حلال چیز کو اپنے اُو پر حرام کروالیا ہو۔ ایسے واقعات کی طرف اشارہ ملتا ہے لیکن باہمی منافرت یا رقابت کا کوئی اشارہ تک نہیں ملتا ہے۔

قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والا صاف محسوس کرتا ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اُمہات المومنین کی باہمی رقابت کا کوئی مسئلہ تھا ہی نہیں۔ ان کی باہمی محبت اور تعلق خاطر کا حال یہ تھا کہ رسولِ پاک کے راز کا افشا بھی کیا تو اپنے میکے میں جا کر نہیں کیا بلکہ اپنی سوتن کے سامنے کیا۔ اس زمانے میں کسی سوتن نے اپنے شوہر سے یہ نہیں کہا کہ ازواج مطہرات میں بھی تو جھگڑے، بدکلامی اور منافرت کا اظہار ہوتا ہے، البتہ بیویوں نے اپنے شوہروں سے یہ ضرور کہا کہ: 'رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں رسولِ پاک سے بحث کرتی ہیں، تو ہم کیوں نہیں کر سکتے؟'

دس سال کی طویل رفاقت کے دوران اگر معمولی نوک جھونک کے دو چار واقعات پیش آ جائیں، تو مناسب نہیں ہے کہ انھیں نو بیویوں کی پوری زندگی کا عنوان بنا دیا جائے۔ ان واقعات کو ان کی سیرت کی پیشانی پر چپکا دیا جائے اور ہزاروں سال تک ان کا تذکرہ کیا جائے۔ درحقیقت نو افراد کی مشترک زندگی میں ایسے چند واقعات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ اصل اہمیت اس کی ہے کہ پوری زندگی کن احساسات، جذبات اور سرگرمیوں کے ساتھ گزاری گئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اُمہات المومنین نے جس قدر باہمی محبت واُلفت کے ساتھ مل جل کر زندگی گزاری، اللہ کے رسول کی رفاقت میں بھی اور دورِ رفاقت کے بعد بھی، وہ بے مثال ہے۔ نہ اس کی مثال پیش کی جا سکتی ہے اور نہ اس سے بہتر کا تصور کیا جا سکتا ہے۔

●●

مارہرہ شریف میں چوالیسواں عرس سیدی برکاتی کا انعقاد

عرس سیدی برکاتی انتہائی تزک واحتشام اور عقیدت ومحبت کے ساتھ ۲۲ تا ۲۵ رفروری کو منعقد ہوا۔ ۲۲ رفروری بعد نماز عشا محفل مولود شریف سے منعقد ہوئی جس میں بڑی تعداد میں علما ودانشوران اور زائرین عرس نے شرکت کی۔ ۲۳ فروری بعد نماز فجر قرآن خوانی اور حلقہ قادریہ (درگاہ شاہ برکات) اور اس کے بعد ۸ بجے صبح پرچم کشائی کی رسم ادا کی گئی۔ پھر 'یوم نظمی' (Nazmi Day) منایا گیا۔ اس محفل کی ابتدا تلاوت قرآن پاک سے ہوئی۔ جامعہ آل رسول مارہرہ شریف کے طلبہ نے حمد ونعت اور تقریری پروگرام پیش کیے۔ مقرر خصوصی کے طور پر خلیفہ سید ملت نے ایک پُرمغز خطاب کیا اور آخر میں وقار ملت حضرت سبطین حیدر برکاتی چشتی نے اپنے نورانی بیان سے سامعین کو محظوظ کیا اور ان کی دعا پر اس مجلس کا اختتام ہوا۔ اس موقع پر بطور مہمان خصوصی مولانا ذیشان احمد مصباحی اور ڈاکٹر مجیب الرحمن علیمی صاحبان جامعہ عارفیہ سید سراواں الہ آبادی نے شرکت فرمائی۔

۲۴ فروری صبح ۱۰ بجے عرس سیدی برکاتی کی پہلی نشست کا آغاز ہوا۔ خصوصی خطاب حضرت مفتی شفیق احمد حنفی نے فرمایا اور اخیر میں حضور سید شاہ سبطین حیدر زیدی قادری برکاتی چشتی کا نورانی بیان ہوا۔ بعد نماز مغرب نائب سجادہ نشین حضور سید صفی حیدر صاحب قبلہ کی قیادت میں گاگر اور چادر کا جلوس نکالا گیا اور صاحب سجادہ کے ہاتھوں مزار مبارک (سید العلماء) کا غسل اور چادر وگلپوشی ہوئی۔ بعد نماز عشا خاندان برکاتیہ کے بزرگوں کے تبرکات کی زیارت کا سنہرا موقع آیا جہاں صاحب سجادہ حضور وقار ملت خرقہ مقدسہ زیب تن فرمایا اور رونق محفل رہے۔ بعدہٗ علما ومشائخ کے نورانی بیانات ہوئے اور پھر محفل سماع سجائی گی۔ ۲۵ فروری بعد نماز فجر قرآن خوانی وحلقہ قادریہ کا اہتمام (درگاہ شاہ برکت اللہ میں) کیا گیا، اور جلسہ دستار بندی کی محفل منعقد ہوئی، جس کی نظامت جناب معین الدین صاحب نے کی۔ قرآن پاک کی تلاوت کے بعد جامعہ آل رسول کے طلبا نعتیہ کلام پیش کیے اور فارغین جامعہ مولانا دانش برکاتی اور مولانا حسین برکاتی نے خطاب پیش کیا۔ مہمان خصوصی حضرت مولانا سید عالمگیر اشرف جیلانی، خانقاہ اشرفیہ، کچھوچھہ رونق اسٹیج ہوئے اور شان اہل بیت اطہار پر ایک پُرمغز علمی خطاب فرمایا، اسی موقع پر مولانا سلمان قادری اورئی کا بھی خطاب ہوا۔ پھر صاحب سجادہ اور علما ومشائخ کے ہاتھوں رسم دستار بندی ادا کی گئی اور فارغین جامعہ دستار وسند سے نوازا گیا۔ محفل کے اخیر میں حضرت مولانا سید شاہ سبطین حیدر ادام اللہ علینا نے عارف باللہ شیخ علامہ عبدالغنی نابلسی نقشبندی قادری رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب 'سازوں کے ساتھ قوالی کی شرعی حیثیت' کا رسم اجرا فرمایا، بعدہٗ محفل قل منعقد ہوئی اور پھر وقار ملت کی دعاؤں پر اس نورانی محفل کا اختتام ہوا۔ **(اسیر نظمی منصور عالم برکاتی علیمی)**

ہندوستان کے بہترین عالم دین

مفتی بلال احمد نوری پورنوی

جنہیں فراموش کر دیا گیا اور جو، اب خاک اوڑھے سو رہے ہیں

از: مولانا منظر محسن مصباحی

شارحِ صحیح مسلم مفتی بلال احمد نوری پورنوی (۱۹۲۳ء/ ۲۰۱۸ء)، ملک العلماء مولانا محمد ظفر الدین بہاری اور مولانا سید افضل حسین مونگیری کے شاگرد اور مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ کے مرید و خلیفہ، موجودہ متعدد اکابر علما و مشائخ کے استاذ و مربی تھے۔ آپ علوم متداولہ کے منفرد المثال عالم اور صاحب بصیرت مفتی تھے۔ آپ نے اپنی زندگی کا ساٹھ برسوں سے زائد کا عرصہ انتہائی یکسوئی کے ساتھ ملک کی متعدد درس گاہوں میں تدریسی خدمات میں گزارا۔ آپ کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں جو زرّیں حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

آپ کے شاگردوں کی ایک طویل فہرست ہے، آپ کی بافیض درس گاہ کے تربیت یافتہ شاگرد ملک کے مختلف حصوں میں آپ کا نام روشن کر رہے ہیں، سیکڑوں شاگرد بڑی بڑی درس گاہوں میں شیخ الحدیث، شیخ التفسیر اور صدر مفتی کے عظیم مناصب پر فائز ہیں، جو ملک و بیرونِ ملک میں دینی و ملی اور تعلیمی و تدریسی خدمات کے ذریعے ''اپنے استاذ و مربی'' کے فیضان کو عام کر رہے ہیں، جب کہ بعض تلامذہ ملک کی معروف خانقاہوں کے سجادہ نشین کی حیثیت سے تصوف و روحانیت کی خدمت اور خلقِ خدا کی رشد و ہدایت میں مصروف ہیں۔

ذیل میں آپ کی حیات و خدمات کا مختصر تعارف قارئین کی نذر ہے:

خاندانی پس منظر: شارح مسلم مفتی بلال احمد نوری رحمہ اللہ کے جد اعلیٰ، قدیم پورنیہ، بہار (موجودہ کٹیہار) کی معروف بستی ''شیشہ باڑی''، متصل ملکِ پور ہاٹ سے نقل مکانی کر کے پورنیہ ضلع کی تحصیل بائسی سے تقریباً ۹ رکیلومیٹر جنوب مشرق میں واقع گاؤں ''بن گواں'' میں آباد ہوئے، آپ کا خاندان نہایت دین دار، شریف النفس، مہذب اور متمول خاندان تھا، اللہ تعالیٰ نے عزت، دولت، شہرت اور مقبولیت کی تمام تر خوبیوں سے نوازا تھا۔

والد ماجد: حضرت امام النحو کے والد ماجد کا نام حاجی عبد الغنی بن حاجی قدم علی بن حاجی شیر علی تھا۔

ولادت: حضرت شارح مسلم کی تاریخ ولادت سرکاری کاغذات میں یکم جنوری ۱۹۲۳ء (۱۳ر جمادی الاول ۱۳۴۱ھ) مرقوم ہے۔

ابتدائی تعلیم: بچپن ہی سے آپ شریف النفس اور حلیم الطبع تھے، والدین کی نگرانی میں آپ کی تعلیم کا آغاز کرایا گیا، منشی محمد مظفر حسین، منشی محمد اوصاف علی اور مولانا عباس حسین جیسے اساتذہ نے آپ کو پڑھایا۔

تعلیم کا دوسرا دور: مدرسہ شرفیہ (چندر گاؤں چکلہ، بائسی، پورنیہ) میں آپ نے پانچ برسوں تک حافظ محمد جمال، منشی محمد عبد المتین سے فارسی کی مروجہ کتابیں اور مولانا تمیز الدین مرحوم سے عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

تعلیم کا تیسرا دور: ۱۹۵۱ء میں آپ نے مدرسہ لطیفیہ بحر العلوم کٹیہار ضلع پورنیہ (قدیم) میں داخلہ لیا، تین برسوں تک یہاں آپ نے مولانا سید محمد ظفر الدین رضوی بہاری، مولانا محمد سلیمان اشرفی بھاگل پوری اور مولانا محمد یوسف عظیم آبادی سے تعلیم حاصل کی۔

فراغت: ۱۹۵۳ء کے اواخر میں آپ مولانا شاہ مصطفیٰ رضا خاں بریلوی رحمہ اللہ کے قائم کردہ ادارہ دار العلوم مظہر اسلام بریلی میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۶ء میں دستار و سند فضیلت سے نوازے گئے، یہاں آپ نے مفتی سید محمد افضل حسین مونگیری، مولانا ثناء اللہ مئوی اور مولانا عبد المبین امروہوی سے اکتساب علم کیا۔ دار العلوم مظہر اسلام بریلی کے رفقا میں علامہ خواجہ مظفر حسین رضوی اور مفتی مجیب اشرف ناگ پوری کے نام قابل ذکر ہیں۔

تدریسی خدمات: زمانۂ طالب علمی ہی سے آپ کی ذہانت و فطانت اور علمی صلاحیت کے چرچے تھے، لہٰذا فارغ ہوتے ہی آپ کو دار العلوم منظر اسلام، بریلی میں بحیثیت مدرس بحال کر لیا گیا، یہاں تین برسوں تک پڑھایا، پھر آپ کے مرشد مولانا شاہ مصطفیٰ رضا خاں

بریلوی نے اپنے ادارہ دارالعلوم مظہر اسلام میں آپ کو بحال کیا، تین برس یہاں بھی رہے، اس کے بعد ملک کے مختلف اداروں کی دعوت پر آپ نے علمی، تدریسی اور فتویٰ نویسی کی خدمات انجام دیں۔

واضح رہے کہ آپ کی علمی صلاحیت کی بنا پر بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں آپ کے مرشد نے دارالعلوم مظہر اسلام بریلی کے لیے دوبارہ آپ کو دعوتِ تدریس دی اور بحیثیت شیخ الحدیث منتخب فرمایا، یہ آپ کے دور تدریس کا وہ زمانہ تھا جب مفتی اختر رضا خان ازہری صاحب جامعہ ازہر نہیں گئے تھے، بلکہ بریلی ہی میں آپ کے پاس زیر تعلیم تھے، حضرت شارح مسلم بارہا اپنی زندگی میں بطور تحدیث نعمت اس بات کا تذکرہ کرتے کہ ''میں نے اپنی حیات میں بے شمار طلبہ کو پڑھایا ہے، ان میں مولانا اختر رضا صاحب کو جامعہ ازہر مصر جانے سے پہلے کلاس وائز درسیات کی اکثر کتب کئی برسوں تک میں نے پڑھائی ہے اور ان پر خصوصی محنت کی ہے۔'' یہ باتیں آپ کے صاحب زادے مولانا افضال نوری اور مولانا سلیم الرحمٰن پورنوی نے بتایا، جو اُس زمانے میں دارالعلوم مظہر اسلام بریلی میں حضرت شارح مسلم کے یہاں زیر تعلیم تھے۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کا قائم کردہ ادارہ دارالعلوم منظر اسلام بریلی کے ذمہ داران نے بھی آپ کی خدمت میں دوبارہ آنے کی گزارش کی، جسے حضرت شارح مسلم نے قبول فرمایا اور منظر اسلام میں (۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۰ء) منصب شیخ الحدیث کو زینت بخشی۔ اس کے بعد متعدد اداروں کے ذمہ داران کی خواہش پر ملک بھر کے متعدد اداروں میں تشنگانِ علوم نبوت کو سیراب کرتے رہے۔ ۲۰۰۳ء تا ۲۰۱۷ء جامعہ قادریہ، ممبئی میں آپ نے تشنگان علوم کو سیراب کیا اور اس درمیان ''شرحِ صحیح مسلم'' بھی لکھی۔

آپ کا تدریسی دور ساٹھ برسوں سے زائد عرصے پر محیط ہے، اس مختصر مضمون میں اس مکمل دور کا تفصیلی تذکرہ ناممکن ہے، لہٰذا ذیل میں ان تعلیمی اداروں کا ایک اجمالی خاکہ پیش کیا جارہا ہے، جہاں آپ نے مسند تدریس کو زینت بخشی:

دارالعلوم منظر اسلام، بریلی (۱۹۵۶ء تا ۱۹۵۸ء)، دارالعلوم مظہر اسلام، بریلی (۱۹۵۹ء تا ۱۹۶۲ء)، دارالعلوم مصطفائیہ، پورنیہ بہار (۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۴ء)، دارالعلوم مظہر اسلام بریلی (۱۹۶۴ء تا ۱۹۶۹ء)، جامعہ عربیہ، سلطان پور، یوپی (۱۹۷۰ء تا ۱۹۷۲ء)، دارالعلوم منظر اسلام بریلی (۱۹۷۳ء تا ۱۹۸۰ء)، جامعہ نعیمیہ، مرادآباد (۱۹۸۰ء تا ۱۹۸۱ء)، جامعہ نوریہ، باقر گنج، بریلی (۱۹۸۲ء تا ۱۹۸۵ء)، دارالعلوم لطیفیہ بحرالعلوم، کٹیہار، بہار (۱۹۸۶ء تا ۱۹۸۸ء)، جامع اشرف، کچھوچھہ (۱۹۸۹ء تا ۱۹۹۰ء)، دارالعلوم اہل سنت، کشن گنج، بہار (۱۹۹۰ء)، الجامعۃ النظامیہ، کٹیہار، بہار (۱۹۹۱ء تا ۱۹۹۳ء)، دارالعلوم تاج المدارس، اڑیسہ (۱۹۹۷ء تا ۱۹۹۸ء)، جامعہ امجدیہ بھیونڈی، مہاراشٹر (۱۹۹۹ء، صرف چھ ماہ)، آنند گجرات کے کسی ادارے میں (نام معلوم نہ ہو سکا) (۲۰۰۰ء تا ۲۰۰۱ء)، جامعہ قادریہ اشرفیہ ممبئی (۲۰۰۳ء تا ۲۰۱۷ء)۔

ان کے علاوہ چھ دہائیوں سے زائد پر محیط اپنی مدت تدریس کے دوران دارالعلوم غریب نواز، الہ آباد اور شہر بلرام پور، اتر پردیش کے ایک ادارے میں بھی آپ نے درس وتدریس کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اس طویل مدت میں آپ ہمیشہ ملک کے معروف و مرکزی اداروں سے منسلک رہے اور متعدد عہدے و مناصب کو زینت بخشتے رہے، ابتدائی دور میں بحیثیت استاذ، پھر شیخ الحدیث، صدرالمدرسین اور صدر شعبۂ افتا کے طور پر اپنا علمی وتحقیقی، تدریسی وتربیتی فیضان لٹاتے رہے۔ آپ کے تلامذہ ومستفیدین کی ایک طویل فہرست ہے، جو ہزاروں افراد پر مشتمل ہے، یہاں چند معروف تلامذہ کا ذکر کیا جارہا ہے:

مفتی محمد اختر رضا خان ازہری بریلوی، مولانا سید محمد ہاشمی میاں کچھوچھوی، مولانا سبحان رضا خان سبحانی میاں، مفتی عبید الرحمٰن رشیدی، مولانا سید محمد کاظم پاشا قادری، مولانا محمد حنیف خان رضوی بریلوی، مولانا سید شاہ محمد اجمل میاں کچھوچھوی، مولانا سید محمود اشرف کچھوچھوی، مفتی محمد عارف بریلوی (سابق شیخ الحدیث منظر اسلام)، مفتی محمد ہاشم یوسفی رشیدی (سابق مفتی دارالافتاء، بریلی)، مفتی شبیر پورنوی، مفتی محمد شبیر روناہی، مولانا صوفی محمد افتخار الہ آبادی، مولانا غلام یزدانی فائق القادری گھوسوی، مولانا قاری رضی اللہ چترویدی، مولانا قاضی فضل احمد بنارس، مولانا صغیر احمد جوکھن پوری، مولانا تطہیر احمد رضوی، مفتی محمد ایوب، مفتی ولی محمد رضوی باسنی، مولانا فروغ القادری، مولانا قمرالدین، بنگال، مولانا انیس القادری (ہوڑہ)۔

بیعت وخلافت: دارالعلوم مظہر اسلام بریلی میں دوران طالب علمی ہی (۱۹۵۴ء تا ۱۹۵۶ء) مولانا شاہ مصطفی رضا خاں بریلوی سے بیعت ہوئے۔ اسی ادارے میں دوران تدریس ۱۹۶۶ء میں آپ کے مرشد نے آپ کے تقویٰ و طہارت کو دیکھ کر، بلا طلب، اجازت و خلافت سے نوازا۔ اس کے علاوہ مولانا سید محمد ظفر الدین رضوی، مولانا سردار احمد لائل پوری اور مولانا احسان علی مظفر پوری رحمہم اللہ نے سلاسل تصوف وطریقت کی اجازت وخلافت سے نوازا۔

شادی، اولاد امجاد: ۱۹۵۶ء میں تعلیم سے فراغت ہوئی اور دارالعلوم مظہر اسلام بریلی میں تدریس کے دوران ۱۹۶۱ء میں آپ کی شادی ہوئی، آپ کو اللہ رب العزت نے تین صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں عطا کی۔

تصنیف وتالیف: آپ کے صاحب زادے مولانا محمد افضال نوری (جو تحصیل بائسی ضلع پورنیہ کے ایک سرکاری ہائی اسکول میں تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں) نے یہ تاریخ ۲۴ر فروری ۲۰۱۸ء کو ٹیلی فونک گفتگو میں مجھ سے بتایا کہ تقریباً چار، پانچ برس قبل میں نے والد گرامی سے ایک بار عرض کی کہ: حضور! آپ نے اپنی بے پناہ صلاحیت وعلمی لیاقت سے مجھ سمیت ہزار ہا شاگرد پیدا کیے ہیں ، کیا ہی بہتر ہوتا کہ آپ ہم جیسوں کے لیے وراثت میں کوئی علمی تحقیقی تصنیف بھی چھوڑ جاتے، اس پر والد گرامی نے فرمایا کہ: ''بیٹا! آپ کی یہ تمنا بھی پوری ہوگی، میں ایک لمبے عرصے سے صحیح مسلم کی شرح لکھ رہا ہوں، جو تکمیل کے قریب ہے۔'' چوں کہ حضرت شارح مسلم نے تقریباً پانچ برس قبل یہ بتایا تھا کہ شرح مسلم تکمیل کے قریب ہے، اس لیے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ مکمل ہو چکی ہوگی۔ ملک بھر میں پھیلے ہوئے حضرت کے ہزاروں تلامذہ، محبین اور علم دوستوں بالخصوص جامعہ قادریہ اشرفیہ ممبئی کے مہتمم حضرت سید معین میاں سے ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اس علمی سرمائے کو ضائع ہونے سے بچائیں گے اور اس کی طباعت واشاعت کا اہتمام کریں گے۔

غروب آفتاب: علم وفن کا یہ درخشندہ آفتاب نصف صدی سے زائد عرصے تک اپنے علم وتحقیق سے دنیا کو روشن کرنے کے بعد بالآخر ۲۳ر جمادی الاول ۱۴۳۹ھ/ ۱۰ر فروری ۲۰۱۸ء، بوقت صبح ساڑھے دس بجے غروب ہو گیا۔ حضرت کے وصال کی خبر سے علمی دنیا میں غم کی لہر دوڑ گئی، اتر دیناج پور، کٹیہار، کشن گنج اور پورنیہ چاروں اضلاع وملک کے دیگر علاقوں سے آپ کے عقیدت مندوں اور تلامذہ ومستفیدین کا انبوہ کثیر اپنے قائد ومربی کے آخری دیدار کے لیے آپ کے گاؤں کی طرف امنڈتے ہوئے سیلاب کی طرح رواں دواں ہو گیا اور صرف چوبیس گھنٹے میں علما، مشائخ اور عقیدت مندوں کی اتنی بڑی بھیڑ جمع ہوگئی کہ جنازے کو آبادی سے باہر لے جانا پڑا۔

نماز جنازہ: ۲۴ر جمادی الاول ۱۴۳۹ھ/ ۱۱ر فروری ۲۰۱۸ء بروز اتوار، صبح دس بجے آپ کے آبائی گاؤں بائسی، ضلع پورنیہ بہار میں مولانا توصیف رضا خان بریلوی نے پڑھائی، جس میں مسلم اکثریتی علاقہ سیمانچل کے مختلف علاقوں سے بکثرت محبین وجاں نثاران اور تلامذہ ومستفیدین نے شرکت کی۔

●●

(بقیہ ص ۳۴ کا)

اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں ،تو آپ لوگوں کو تکلیف کیوں ہوتی ہے، آپ معاشرے میں تفریق اور نفرت کا بیج بو کر کیا پیغام دینا چاہتے ہیں۔

قصہ مختصر، شب براءت بڑی عظیم، برکت والی اور بخشش والی رات ہے، مگر یہ بھی یاد رکھیے کہ بخشش انھی لوگوں کی ہی ہوتی ہے جو صحیح معنوں میں اپنی بخشش کے طلب گار ہوتے ہیں اور اس کے تقاضوں کو صحیح طور پر عملی جامہ پہناتے ہیں یعنی خدا کے حضور سچے دل سے اپنا گناہوں کی توبہ کرتے ہیں ،آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد باندھتے ہیں اور اپنے بھائیوں کو معافی دیتے ہیں ،دلوں سے کینے اور بغض ختم کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے رنج وغم مٹا کر اتحاد یگانگت کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس انسان کی بخشش نہیں ہوتی ہے جو صرف نوافل و وظائف میں تو لگا رہتا ہے لیکن وہ نہ تو خدا کے حضور معافی کا خواستگار ہوتا ہے اور نہ ہی خود سے ناراض لوگوں کی ناراضی دور کر کے انہیں راضی کرتا ہے۔ شب براءت بس قریب ہے، آئیں اس کے لیے ابھی سے تیار ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مبارک شب کی فضیلتوں اور برکتوں سے بہرہ ور فرمائے۔ آمین بجاہ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم

●●

چند خوب صورت باتیں

پیش کش: مدیحہ مظہر

کبھی کبھی قبرستان بھی چلے جایا کرو

خوشی کا سماں تھا، لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔ کوئی تصویر کھنچوانے میں مگن تھا تو کوئی خوشیاں بٹورنے میں۔ یہ میرے دوست کی شادی کی تقریب تھی، ہم تمام دوست اس موقع کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔ میں نے اپنے دوست کو مبارک باد دی اور اسے تنگ کرنے کے لیے شادی سے متعلق کچھ لطیفے سنائے اور الوداع کہا۔ گھر پہنچا تو رات کے ڈھائی بج چکے تھے اور شدید نیند آ رہی تھی۔ زندگی بہت خوبصورت اور رنگین لگ رہی تھی۔ تین بجے میں لیٹا، سونے کی کوشش کر رہا تھا اور اپنے موبائل میں شادی کی تصویریں دیکھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

صبح ۱۱ بج کر ۳۵ منٹ پر آنکھ کھلی، چھٹی کا دن تھا، اٹھتے ہی اپنے موبائل پر انٹرنیٹ چلایا۔ اس وقت میرا موڈ کچھ زیادہ ہی خوشگوار تھا۔ زندگی بہت حسین اور پیاری لگ رہی تھی۔ میں میسج باکس پر گیا تو میرے دوست کا میسج آیا ہوا تھا کہ اس کے والد انتقال کر گئے ہیں اور ظہر کے بعد نماز جنازہ ہے۔ مجھے گھبراہٹ سی محسوس ہوئی۔ وہ میرا بہت عزیز دوست تھا اور پچھلے ہی دن میری اسے ملاقات ہوئی تھی جب ہم خوشیاں منا رہے تھے۔ میں نے شلوار قمیص پہنی اور اپنے چند دوستوں کے ساتھ اس کے گھر پہنچا۔ افسردگی کا میلہ دیکھ کر دل اشک بار ہو گیا۔ جب اپنے دوست کے والد کا چہرہ دیکھا تو مجھے کچھ سال پہلے کا وہ وقت یاد آ گیا جب ہماری شرارتوں کے باعث وہ ہم پر غصہ کر رہے تھے۔ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اگلی ملاقات ایسی ہوگی۔ دوست کو روتا دیکھ کر نا چاہتے ہوئے بھی میری آنکھوں میں نمی نمودار ہو گئی۔ نماز جنازہ ادا کی اور دفنانے کے لیے قبرستان کا رخ کیا۔

کچھ گھنٹے پہلے میں زندگی کے خوبصورت لمحے انجوائے کر رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا زندگی کتنی پیاری اور حسین ہے لیکن جب میں نے جنازہ اٹھایا تو یقین جانیے زندگی کی حقیقت میرے سامنے آ گئی۔ رنگین زندگی بے رنگی دکھائی دی۔ زندگی کی خوبصورتی، خوفناکی میں تبدیل ہو گئی۔ قبر کو دیکھ کر مجھے اپنا مستقبل اور دنیاوی زندگی کی آخری منزل صاف صاف دکھائی دے رہی تھی۔ شاید ہمارے گناہوں اور گمراہی کی وجہ بھی یہی ہے کہ ہم زندگی کو لافانی سمجھ بیٹھے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ اس دنیا میں ہم چند دنوں کے مہمان ہیں۔ ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ ہمارے پیدا ہونے سے پہلے ہماری موت لکھ دی گئی ہے۔ چنانچہ اگر آپ بھی دنیا کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہوں تو میں آپ کو تھوڑی دیر کے لیے قبرستان جانے کی تجویز دوں گا۔

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے تماشا نہیں ہے

□□□

ایک خوبصورت حکایت

اسلام کے عظیم مفکر حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ ایک خوبصورت حکایت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ دنیا کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص جنگل میں چلا جا رہا تھا، اُس نے دیکھا کہ میرے پیچھے ایک شیر آ رہا ہے، وہ بھاگا، جب تھک گیا تو دیکھا کہ آگے ایک گڑھا ہے، چاہا کہ گڑھے میں گر کر جان بچائے، لیکن اُس میں اژدہا نظر آیا۔ اب آگے اژدہے کا خوف اور پیچھے شیر کا ڈر کہ اچانک اُس کی نظر ایک درخت کی ٹہنی پر پڑی اور اُس نے اُس پر ہاتھ ڈال دیا، مگر ہاتھ ڈالنے کے بعد معلوم ہوا کہ اُس درخت کی جڑ کو دو سیاہ و سفید چوہے کاٹ رہے ہیں، بہت خائف ہوا کہ اب تھوڑی دیر میں درخت کی جڑ کٹ گئی تو میں گر جاؤں گا اور شیر اور اژدہے کا شکار بن جاؤں گا۔

اتفاق سے اُسے درخت کے اوپر ایک شہد کا چھتا نظر آ گیا۔ وہ اُس میٹھے شہد کو حاصل کرنے اور پینے میں ایسا مصروف ہو گیا کہ نہ اُسے شیر کا خوف رہا اور نہ اژدہے کی فکر، یکا یک درخت کی جڑ کٹ گئی اور وہ گر پڑا، شیر نے پھاڑ کر گڑھے میں گرا دیا اور وہ گڑھے میں اژدھے

کے منہ میں جا پھنسا۔

دنیا میں انسان کی مثال بھی کچھ اسی طرح ہے۔ یہاں جنگل سے مراد دنیا ہے، اور شیر موت ہے کہ پیچھے لگی ہوئی ہے، اور گڑھا قبر ہے جو اُس کے آگے ہے، اور اژدہا اعمالِ بد ہیں کہ قبر میں ڈسیں گے، اور دو چوہے سیاہ وسفید دن اور رات ہیں، اور درخت گویا عمر ہے، اور شہد کا چھتا دنیائے فانی کی غافل کر دینے والی لذات وخواہشات ہیں کہ انسان دنیا کی فکر میں موت، قبر، اعمالِ بد اور جواب دہی وغیرہ سب کو بھول جاتا ہے اور پھر اچانک موت آجانے پر سوائے حسرت و ندامت کے کچھ ساتھ نہیں لے جاتا۔

□□□

سب کے کہنے سے 'برا' اچھا نہیں ہو جاتا

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ کی شادی کو عرصہ ہو گیا مگر گھر میں ولی عہد کی کمی ہی رہی تو اس نے سلطنت کے کونے کونے سے اپنے اور اپنی ملکہ کے علاج معالجے کے لیے حکیم بلوائے۔ مقدر میں لکھا تھا اور اللہ نے ملکہ کی گود ہری کر دی۔ بیٹا پیدا ہوا تو بادشاہ کو یہ دیکھ کر چپ ہی لگ گئی کہ اس کے بیٹے میں ایک پیدائشی معذوری تھی اور وہ ایک کان کے ساتھ پیدا ہوا تھا۔ بادشاہ نے اپنے سارے وزیر بلوا بھیجے اور ان سے مشورہ کیا کہ اتنی بڑی سلطنت کی باگ دوڑ سنبھالنے کے لیے پیدا ہونے والا یہ ولی عہد جب اپنے آپ کو یوں معذور پائے گا تو احساس محرومی کا شکار ہو جائے گا کس طرح اس کی اس خامی پر قابو پایا جائے؟

وزیروں نے مشورہ دیا بادشاہ سلامت، یہ تو کوئی بات ہی نہیں، اعلان کرا دیجیے کہ آج سے جو بھی بچہ پیدا ہو اس کا ایک کان کاٹ لیا جائے۔ شہزادے کے سارے ہمجولی اور اس کے سامنے پلنے والی ساری نسل جب ایک کان والی ہوگی تو شہزادے کے دل میں کسی قسم کی محرومی کا احساس ہی نہیں پیدا ہوگا۔ حکم نافذ کر کے عمل درآمد شروع کرا دیا گیا، اگلے دسیوں سالوں میں مملکت میں ایک کان والی نسل دیکھنے کو ملی اور لوگ اس عادت اور تقلید میں رچ بس گئے۔

ایک بار کہیں سے گھومتا پھرتا بھولا بھٹکا ایک نوجوان اس مملکت میں آ ٹپکا۔ لوگ دو کانوں والے لڑکے کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے، بچے اس عجیب الخلقت نوجوان کے پیچھے پڑ گئے اور دو کانوں دو کانوں والا کہہ کر چھیڑتے۔ اس نوجوان کو بھی اپنا آپ ایک عجوبہ لگنا شروع ہو گیا تا کہ وہ ان لوگوں میں تماشہ بن کر نہ رہے اُس نے اپنا ایک کان ہی کٹوا لیا۔

عزیز بچو! کیا ایسا ممکن ہے کہ پوری کی پوری خلقت ہی ایسی عقلی معذور بن جائے؟ جی، انسانی تاریخ میں ایسا ہزاروں بار ہو چکا ہے۔ لوگوں کی اسی کج فہمی اور ٹیڑھی عقلی معذوری کی اصلاح کے لیے ہی تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ بار بار اپنے نبی بھیجتا رہا جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی پوری قوم شرک کی معذوری کا شکار تھی، ایک اکیلے ابراہیم علیہ السلام ان میں اور ان کو بہت ہی عجیب دکھائی دیتے تھے۔ سیدنا لوط علیہ السلام کی پوری کی پوری قوم فطرت کی مخالف سمت میں چلنے والی تھی، ایک اکیلے لوط علیہ السلام ان میں عجیب دکھائی دیتے تھے کیوں کہ وہ ان جیسا کام نہیں کرتے تھے۔ سیدنا شعیب علیہ السلام کی پوری کی پوری قوم سود اور چور بازاری میں ایسی مبتلا تھی کہ ان میں اکیلے شعیب (علیہ السلام) بہت ہی انوکھے نظر آتے تھے۔

میرے پیارو! فقہ میں ایک بنیادی اصول یہ ہوتا ہے کہ: سب لوگوں کا کسی ایک بات پر متفق ہو جانا اسے حلال نہیں بنا دیا کرتا۔

غلط ہمیشہ غلط رہے گا بھلے ساری مخلوق اسے کرنا شروع کر دے اور صحیح ہمیشہ صحیح رہے گا بھلے مخلوق میں سے کوئی ایک بھی اسے کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ بات کان کٹوا لینے کی نہیں ہے۔ اگر تم کو یقین ہے کہ تم ٹھیک ہو تو پھر لوگوں کو راضی کرنے کے لیے اپنے سچ سے نہ پھرو۔ اگر وہ اپنے غلط پر شرمندہ نہیں ہیں تو تم کیوں اپنے ٹھیک ہونے پر شرماتے ہو؟ ایک اور آخری بات، وہ جو کہتے ہیں ناں کہ سارے کے سارے لوگ ایسے کہتے ہیں اس لیے بات صحیح ہی ہوگی تو ایسے لوگوں کو یہ جواب دو کہ جناب قرآن میں جب بھی میں 'سارے کے سارے' لوگوں کا کبھی ذکر آیا ہے تو ان صفتوں کو بتاتے ہوئے آیا ہے کہ:

وہ تو عقل ہی نہیں رکھتے۔

وہ تو علم ہی نہیں رکھتے۔

وہ تو شکر ہی نہیں ادا کرتے۔

□□□

آپ کے دوست آپ کے دانتوں کی مانند ہوتے ہیں

یہ تحریر مجھے واٹس اپ کے ذریعے ایک دوست نے بھیجی ہے، کہنے والا کون تھا مجھے پتہ نہیں ہے مگر فائدے کی بات ہے تو میں نے

سوچا کیوں نا آپ سے بھی شیئر کرلوں۔ ہوسکتا ہے عنوان دیکھ کرآپ کو حیرت ہو، یہ کیسی مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ اب آپ کے دوست آپ کے دانتوں کی مانند ہو گئے؟ اصل میں یہ تشبیہ ایک حکیم صاحب نے بنائی ہے جو اپنے پوتے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمارہے تھے: اے میرے بیٹے! مجھے زندگی نے یہ سکھلایا ہے کہ تیرے دوست تیرے دانتوں کی مانند ہوتے ہیں، ہمیشہ تیرے ساتھ رہنے والے، کہیں تیری مدد و معاونت پر کمر بند تو کہیں تجھے درد کی شدت سے چیخیں نکلوانے پر آمادہ۔ بس تجھ پر لازم ہے کہ اپنے دوستوں کی ویسی ہی نگہداشت اور صفائی ستھرائی رکھا کر جس طرح تو اپنے دانتوں کو صاف ستھرا کر کے رکھتا ہے۔ ان کا اہتمام اور حفاظت کیا کرتا کہ تجھے ان سے فائدہ ملتا رہے۔ جس دوست سے تجھے دکھ و تکلیف پہنچے اس دوست کی مثال کیڑا لگے دانت کی سی ہے پس تجھ پر واجب ہے کہ اس کی اصلاح کے لیے کچھ کر یا اسے خاص توجہ دے کر مضبوط اور مفید بنا اور تیرا وہ دوست جو تجھ سے پیار سے پیش آئے یا تجھ سے محبت رکھے وہ تو تیرے چمکدار سفید دانتوں کی مانند ہے، پس اس کی مزید حفاظت کرا اور اسے اچھا بنا کر رکھ۔

جو دانت ٹوٹ گیا وہ ایک بچھڑ جانے والے دوست کی مانند ہے جس کے فراق کا غم کچھ عرصہ تو درد اور اذیت دیتا ہے مگر پھر یہ درد جاتا رہتا ہے مگر جس طرح ٹوٹ جانے والے دانت کا فراغ اور خول تجھے ہمیشہ اس کے نہ ہونے کا احساس، اور اس سے گزشتہ حاصل ہونے والے فوائد کا احساس یاد دلاتا رہتا ہے بالکل اُسی طرح بچھڑ جانے والے دوست کے فراق کا غم اور دل میں اس کی خالی جگہ بھی ہمیشہ ہمیں اُس کی یاد دلاتی رہتی ہے۔

اس بات میں حکمت اور عبرت کے ساتھ ساتھ وفادار اور مخلص دوستوں سے اچھے برتاؤ اور رکھ رکھاؤ کے بارے میں مہارت کا بھی بتایا گیا ہے تاہم ایسے دوست جو صرف مطلب براری کے لیے تعلق بنا کر رکھتے ہوں ان کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ یہ کیڑے لگے دانتوں کی مانند ہوتے ہیں؛ اگر ان کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ دانتوں میں تھوڑے خول یا سوراخ سے بڑے سے بڑے ہوتے جائیں گے، اس طرح ان سے ملنے والا ضرر یا نقصان اور اس ضرر کے نتیجے میں ہونے والا درد بھی زیادہ سے زیادہ ہوتا جائے گا۔ ایسی صورت میں ہمارا فرض بنتا ہے کہ یا تو اس کا علاج کرائیں، اس کا نقص دور کرنے کی کوشش کریں یا پھر اسے جتنا جلدی ہو سکے باہر نکال پھینکیں۔ اچھے دوست تو موتیوں کی طرح چمکتے اور صحتمند دانتوں کی مانند ہوتے ہیں۔

دوستی کی ساری تشبیہات میں سب سے بڑھ کر اچھی تشبیہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ ہمارے آپ کے سب کے پیارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق دوست دو قسم کے ہوتے ہیں: پہلی قسم اچھے دوستوں کی ہے جو عطر اُٹھائے پھرتے ہوں، یا تو وہ تمہیں اپنے عطر میں سے کچھ عطا کریں گے، یا تمہیں کوئی عطر فروخت کریں گے، اگر کچھ تم نے ان عطور میں سے کچھ بھی نہ لیا یا کچھ بھی نہ خریدا تب بھی اُن عطور میں سے نکلی خوشبو ہی تمہیں معطر کر دے گی۔ اس کا مطلب یہ بھی بنتا ہے کہ تم اپنے اس دوست سے سچی محبت پاؤ گے، اُس کی مخلص مسکراہٹ سے اپنے دل کو خوش کرو گے یا پھر اُس کی اچھی باتوں سے کچھ فیض پاؤ گے۔

دوستوں کی دوسری قسم ان برے دوستوں (دانتوں کو کیڑا لگے جیسے دوست) کی ہے جن کو ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے آگ کی بھٹی دھونکنے والے لوہار سے دی ہے۔ جس کے پاس جا کر بیٹھو تو یا تمہارے کپڑے جلیں گے یا تم کوئلوں کی گندی بدبو سونگھو گے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بنتا ہے کہ برے دوست لوہے جیسے سخت دل والے، مطلب برار، بری باتیں کہنے اور کرنے والے ہوتے ہیں۔

عزیز ساتھیو! اپنے لیے اچھے دوست چُنو جو با وفا ہوں، مخلص ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج کے زمانے میں ایسے دوستوں کی قلت ہے مگر ایسے جب مل جائیں تو ہمیں چاہیے کہ ان سے بنا کر رکھیں۔ برے دوستوں سے اگر تعلقات رکھنا اتنا ہی ناگزیر ہوں تو ہمیں چاہیے کہ ایک فاصلہ رکھ کر تعلقات بنائیں۔ ان بُرے دوستوں میں سب سے بدتر وہ دوست ہیں جن کی باتوں سے دل دُکھے اور جن کی حرکتوں سے کوفت اور اذیت ہو۔

●●

ہمارا نعرہ:

علم و عمل عام کریں۔۔۔۔ ایس ڈی آئی کا کام کریں

قارئین کے خیالات وتاثرات

از: قارئین

مسجد کے چند آداب اور موبائل فون کا استعمال

مسجد اللہ کا گھر ہے، عبادت کی جگہ ہے۔ مسجد میں ایسا ماحول قائم رکھنے کا اہتمام کرنا چاہیے کہ تمام نمازی پورے اطمینان وسکون اور خشوع وخضوع کے ساتھ نمازیں ادا کرسکیں۔ مسجد میں ہمیں ہر اُس کام سے بچنا ضروری ہے جس سے نمازیوں کے خشوع وخضوع میں خلل پیدا ہوتا ہو یا نماز سے توجہ ہٹ جاتی ہو۔ اسی وجہ سے بہت چھوٹے، ناسمجھ بچوں کو مسجد میں ساتھ لانے سے منع کیا گیا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک نے یہ مشاہدہ کیا ہوگا کہ عموماً بچے یا تو نماز شروع ہوتے ہی رونا شروع کردیتے ہیں۔ باپ کے ساتھ کھڑے ہوں گے تو اس کی ٹانگیں پکڑ کر سلام پھیرنے تک روتے رہیں گے یا صفوں کے درمیان نمازیوں کے سامنے دوڑتے رہیں گے۔ بعض حضرات مسجد میں زور زور سے باتیں کرتے ہیں، یہ بھی مسجد کے آداب کے خلاف ہے۔

حضرت سائب بن یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں: میں مسجد میں سویا تھا، ایک شخص نے مجھ پر کنکری پھینکی، دیکھا تو امیر المومنین فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ موجود ہیں، فرمایا: جاؤ ان دونوں شخصوں کو میرے پاس لاؤ۔ میں ان دونوں کو حاضر لایا۔ فرمایا: تم دونوں کس قبیلہ کے ہو؟ یا کہاں کے رہنے والے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ طائف کے رہنے والے ہیں۔ اِس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: اگر تم اہل مدینہ سے ہوتے تو میں تمھیں سزا دیتا، (کیوں کہ اہل مدینہ آداب مسجد سے واقف تھے) کہ تم رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں آواز بلند کرتے ہو۔ (صحیح البخاری، کتاب الصلاۃ، باب رفع الصوت فی المسجد)

حضرت سلمان بن بریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے مسجد میں اعلان کیا کہ سرخ اونٹ کے بارے میں کون بتائے گا، (یعنی میرا سرخ اونٹ غائب ہوگیا ہے، اگر کسی کو معلوم ہو تو بتائے) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تجھے تیرا اونٹ نہ ملے۔ بے شک مسجدیں تو مخصوص کام یعنی عبادت کے لئے بنائی گئی ہیں۔ (صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النہی عن نشد الضالۃ فی المسجد۔۔۔)

آج کل پوری دنیا میں موبائل فون کا استعمال بہت عام ہوگیا ہے۔ ان میں بے شمار رنگ ٹون ریکارڈ کی جاسکتی ہیں۔ اکثر صورتوں میں فلمی گانے، گانوں کی دُھنیں، خوفناک آوازیں، شور وغل اور تلاوت قرآن واذان اور نعت وغیرہ بھی رنگ ٹون کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ ایک فقہی استفسار کے جواب میں فتویٰ دیا گیا ہے کہ رنگ ٹون کے طور پر تلاوت پاک کا استعمال ناجائز ہے۔ اس لئے کہ کال کا جواب دینے کے لئے جب ہم بٹن دباتے ہیں تو قرآن پاک کی آیات بیچ ہی میں کٹ جاتی ہیں، پوری آیت مکمل نہیں ہو پاتی جو آیات کی بے ادبی کے مترادف ہے۔ اسی طرح موبائل کے ساتھ اگر ہم ٹوائلٹ میں ہوں اور اس وقت یہ رنگ ٹون بجیں تو خود ہی اندازہ کیجیے کہ یہ ہماری کتنی بڑی لاپروائی اور آیات کی کس قدر بے ادبی ہوگی۔ اس سلسلے میں چند باتیں یاد رکھنے کے قابل ہیں:

(۱) یہ عادت بنالیں کہ مسجد میں داخل ہوتے ہی فوراً فون بند کردیں یا وائبریشن یا سائیلنٹ موڈ پر رکھ دیں۔

(۲) وضو کرنے سے پہلے جب جوتے، موزے، چپل، گھڑی، ٹوپی یا چشمہ نکال کر بازو میں رکھ دیتے ہیں، اسی وقت فون بھی بند کردیں۔

(۳) فون بند نہ کرنے کی وجہ سے نماز کے دوران گھنٹیاں بجنے لگیں تو اسے احتیاط سے بند کرنے کی کوشش کیجیے، اس طرح کہ جیب میں ہاتھ ڈال کر معمولی حرکت سے اسے بند کردیں کیوں کہ دورانِ نماز عمل قلیل سے نماز باطل نہیں ہوتی۔ (یعنی فون بند کرنے کے لیے اتنی زیادہ حرکت نہ کریں کہ جس سے دوسرا دیکھنے والا یہ سمجھے کہ آپ نماز نہیں پڑھ رہے ہیں۔ تاہم ایسا بھی نہ کیجیے کہ اگر نماز میں

گھنٹی بجے، تو پہلے جیب سے فون نکالیے، کال کرنے والے کا نام یا نمبر دیکھئے اور پھر اطمینان سے بند کیجیے، ایسا کرنا غلط ہے، ایسی حرکت کرنے سے نماز خراب ہو جائے گی)۔

(۴) کسی کا فون نماز کے دوران بجتا رہا، ایسا شخص اپنی غلطی پر خود نادم رہتا ہے، نماز کے فوراً بعد بعض لوگ ایسے شخص کو ڈانٹ کر سارے لوگوں کے سامنے بے عزت کر دیتے ہیں، اس سے اجتناب کریں کیوں کہ ایسا کرنے سے وہ شخص دل برداشتہ ہو جائے گا اور ممکن ہے وہ دوبارہ مسجد آنا ہی چھوڑ دے اس لیے کسی کو ڈانٹنے ڈپٹنے سے پرہیز کریں۔

(۵) جس طرح لوگ اپنے طرز لباس، بالوں کے اسٹائل، بات چیت سے اپنی اندرونی شخصیت کو ظاہر کرتے ہیں، اسی طرح موبائل کے رنگ ٹون سے بھی انسان کی طبیعت اور اس کے مزاج کا پتہ چلتا ہے، اس لیے عام حالات میں بھی سنجیدہ اور باذوق رنگ ٹون رکھیں تاکہ آپ کی شخصیت اور مزاج کی بہتری کا پتہ چلے۔

اللہ پاک ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے اور مذکورہ بالا باتوں پر عمل کی توفیق بخشے۔ آمین

از: محمد شاہد علی علیمی سعدی، استاذ جامعہ فاطمۃ الزہرا دھوراجی

□□□

اصول وفروع میں معاشرے کی بے راہ روی

بڑے افسوس کی بات ہے کہ آج کے اس پرخطر دور میں معاشرہ کا رجحان دین کے اصول کو چھوڑ کر اس کے فروعات کی طرف ہو گیا ہے، اسلام کا ستون پانچ چیزوں پر ہے اور وہ یہ ہیں ''توحید وشہادت کا زبانی وقلبی اقرار، نماز، روزہ، حج وزکوۃ۔ اس کے علاوہ یوم آخرت، مرنے کے بعد اٹھایا جانا وغیرہ یہ سب ایمان واعتقاد سے تعلق رکھتے ہیں ان کو تسلیم کرنا ایمان سے ہے۔ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کر دے تو خارج از اسلام ہو جائے گا،، اور کچھ افعال ایسے ہیں جو اس کے فروع کہلاتے ہیں جیسے کہ جلوس نکالنا، مزارات پر جانا، ایصال ثواب کرنا اور اسی طرح سے یوم ولادت رسول منانا وغیرہ۔ اب اگر کوئی شخص مذکورہ بالا اُمور کو نہ انجام دے پائے یا نہ دے (نہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کو دل سے درست جانے لیکن بس یوں ہی نہ دے) تو وہ بد مذہب یا گمراہ یا کافر نہیں کہلائے گا وہ اب بھی مسلمان ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ اس کی برکتوں سے محروم رہے گا۔ مگر افسوس صد افسوس کہ آج ان فروعی اُمور کو ہمارے معاشرہ نے فرض کا درجہ دے رکھا ہے، خوب دل جمعی کے ساتھ ان کو کرتے ہیں، انھیں بجالانے میں ذرا بھی پیچھے نہیں ہٹتے اور جو افعال واحکام دین کی اصل کی حیثیت رکھتے ہیں ان سے بالکل کنارہ کش ہو گئے ہیں۔

خدارا! اپنے ذہن وفکر کو بدلیے اور جس چیز کو اسلام نے جو درجہ دیا ہے اس کو اسی درجہ میں رکھیے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے فرائض پر دھیان دیجیے اس کے بعد فروعات پر عمل کرنے کی کوشش کیجیے اور یہ سب خیالات دل سے نکال دیجیے کہ اگر کوئی کسی کی یوم ولادت یا عرس مبارک نہ منا پائے یا جان بوجھ کر نہ منائے تو بھی کوئی حرج نہیں کیوں کہ یہ شرائط ایمان اور ضروریات دین سے نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی نبی یا صحابی کو برا کہے تو یقیناً وہ خارج از اسلام ہے لیکن اگر کوئی کسی صحابی یا نبی کی یوم ولادت نہ منا پائے یا نہ منائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کے دل میں ایمان نہیں یا یہ کہ وہ ان سے محبت نہیں کرتا یا ان کے لیے اپنے دل میں بغض رکھتا ہے، ایسا بالکل نہیں ہے اور اگر اس کو اتنا زیادہ ضروری سمجھ لیا جائے تب تو لوگ حرج میں پڑ جائیں گے کیوں کہ حضرات انبیاے کرام اور صحابہ عظام بے شمار ہیں، اب اگر ان سب کا ولادت منایا جانے لگے تب تو لوگ ہمیشہ ولادت ہی مناتے رہیں گے۔ اس لیے مسلمانوں سے گزارش ہے کہ فرائض وواجبات وسنن پر دھیان دین، اگر ان پر عمل نہیں ہو سکا تو خسارے میں رہیں گے۔

رہی بات عقیدے کی تو ہر سنی انبیاے کرام یا صحابہ کرام وبزرگان دین کو مانتا ہے، ان سے محبت کرتا ہے، ان سب پر اپنا ایمان رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ فرداً فرداً سب کا یوم ولادت یا عرس نہیں منا پاتا۔ تو اب اگر ایسا کوئی نہ کر پائے تو کیا وہ اپنے مذہب سے ہٹ گیا؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو درمیانہ روی کی تعلیم دیتا ہے اور افراط تفریط سے منع کرتا ہے۔ لہذا عرض ہے کہ اسلام کے پیروکار اور متبعین اپنی طرف سے اس میں افراط وتفریط کو شامل نہ کریں۔ اللہ تعالی ہم سب کو مذہب اسلام کے بتائے ہوئے احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور بے راہ روی اور افراط وتفریط کا شکار ہونے سے بچائے۔

از: مولانا ازہر الدین، استاذ دار العلوم قادریہ نجم العلوم، مالیگاؤں

●●

معلومات کا خزانہ

۵۱

از: محمد ضیاء الدین برکاتی

سوال: پیغمبروں کے نام پر قرآن میں کل کتنی سورتیں ہیں؟
جواب: قرآن میں پیغمبروں کے نام پر چھ سورتیں ہیں۔ وہ یہ ہیں: یونس، یوسف، ہود، ابراہیم، محمد اور نوح۔
سوال: قرآن میں کس واحد شخص کا تذکرہ ہے جسے اس کی کنیت سے پکارا گیا۔
جواب: ابولہب
سوال: قرآن کی بارہ سورتیں کون ہیں جن کے نام میں نقطہ نہیں آتا؟
جواب: مائدہ، ہود، رعد، روم، ص، محمد، طور، ملک، دہر، اعلیٰ، عصر، طہ۔
سوال: قرآن پاک کا سب سے پہلے اردو ترجمہ کس نے کیا؟
جواب: ۱۷۷۶ میں شاہ رفیع الدین نے کیا۔
سوال: سب سے پہلے "خلیفہ" کا لقب کس کو ملا؟
جواب: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو۔
سوال: سب سے پہلے امیر المومنین کا لقب کسے ملا؟
جواب: حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو۔
سوال: سب سے پہلے "قاضی القضاۃ" کا لقب کسے ملا؟
جواب: امام ابو یوسف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو۔
سوال: سب سے پہلے "سلطان" کا لقب کسے ملا؟
جواب: محمود غزنوی کو۔
سوال: دنیا کا سب سے خطرناک اور طاقت ور جانور کون ہے؟
جواب: دنیا کا سب سے طاقت ور اور خطرناک جانور سانپ ہے، یہ امریکہ کے کیلی فورنیا کے جنگلوں میں ملنے والا "ویسٹرن ڈائمنڈ بیک ریٹل اسنیک" ہے۔ جو دنیا کا سب سے صابر شکاری ہے، یہ اکیلے چھپ کر شکار کرتا ہے، یہ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا شکار کرتا ہے، بارہا یہ اپنے شکار کا انتظار دو سال تک بغیر کھائے پیے کرتا ہے لیکن جب شکار سامنے آتا ہے تو بڑے بھیانک انداز میں اس کا شکار کرتا ہے۔ یہ اپنا شکار ۴۴ سے ۷۰ ملی سکنڈ میں ہی کر لیتا ہے جب کہ ہماری پلک جھپکنے میں ۲۰۰ ملی سکنڈ لگتے ہیں۔ امریکی سائنس داں ڈیوڈ پیننگ کہتے ہیں کہ یہ سانپ 30G تک کی طاقت سے اپنے شکار پر جھپٹتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جتنی طاقت سے زمین ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے اس سے ۳۰ گنا طاقت سے یہ اپنے شکار پر جھپٹے ہیں۔

لوگوں کا جو یہ خیال ہے کہ دنیا کا سب سے طاقت ور ترین جانور شیر، ہاتھی اور وہیل مچھلی ہے، یہ غلط ہے۔ (بی بی سی، ہندی۔ ۲۷/۵/۱۶)

سوال: کیا L.P.G گیس سلینڈر کی Expiry date ہوتی ہے؟
جواب: L.P.G گیس سلینڈر کی Expiry date ہوتی ہے۔ اس تاریخ کے گزر جانے کے بعد گیس سلینڈر کو استعمال کرنا بم کی طرح خطرناک ہوسکتا ہے۔ عام طور پر گیس سلینڈر کی رِفل لیتے وقت صارفین کا دھیان اس کے وزن اور رفل پر ہی ہوتی ہے، انھیں اس کی اکسپائری ڈیٹ معلوم ہی نہیں ہوتی۔ اس کا فائدہ L.P.G کی سہولیات مہیا کرانے والی کمپنیاں اٹھاتی ہیں اور بے روک ٹوک ایسے گیس ہمارے گھروں تک پہنچاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گیس سلنڈروں کے پھٹنے سے حادثے ہوتے رہتے ہیں۔ آیئے! ہم آپ کی حفاظت کے لیے اکسپائری ڈیٹ معلوم کرنے کا طریقہ بتاتے ہیں۔

سلنڈر کے اوپری حصے پر اسے پکڑنے کے لیے گول رنگ ہوتی ہے اور اس کے نیچے تینوں پٹیوں میں سے ایک پر کالے رنگ سے سلنڈر کی اکسپائری ڈیٹ لکھی ہوتی ہے، اس کے تحت انگریزی میں A.B.C اور D میں سے کوئی ایک حرف درج ہوتا ہے اور ساتھ میں دو گنتیاں اور بھی لکھی ہوتی ہیں۔ A سے مراد سال کی پہلی سہ ماہی مراد ہوتی ہے۔ (جنوری، فروری، مارچ) اور B سے مراد سال کی دوسری سہ ماہی ہوتی ہے، یعنی (اپریل، مئی، جون)۔ C سے سال کی تیسری سہ ماہی مراد ہوتی ہے۔ یعنی (جولائی، اگست اور ستمبر)۔ D سے مراد سال کی چوتھی سہ ماہی ہے۔ یعنی (اکتوبر، نومبر اور دسمبر)۔ اس کے بعد لکھی ہوئی دو گنتیاں Expiry سال کو متعین کرتی ہیں، مثلاً اگر سلنڈر پر A - 18 لکھا ہو تو سلنڈر کی اکسپائری ڈیٹ مارچ ۲۰۱۸ ہے۔ یعنی اس کے بعد اس کا استعمال کرنا جان لیوا ثابت ہوسکتا ہے۔ ایسی صورت میں صارفین کو چاہیے کہ ایسے سلینڈروں کو نہ لیں اور گیس ایجنسی کو فوراً اس بارے میں خبر کریں۔

●●

دینی، دعوتی، مذہبی وتحریکی سرگرمیاں

از: ادارہ

نیرل نوی ممبئی میں سنی دعوت اسلامی کا ایک روزہ اجلاس

نیرل: دعوت وتبلیغ کی عالم گیر تحریک سنی دعوت اسلامی کا ایک روزہ سنی اجتماع ۱۱ مارچ ۲۰۱۸ کو نیرول کے تانڈیل میدان میں صبح دس بجے شروع ہوا جس میں لندن سے تشریف لائے عالمی شہرت یافتہ عالم دین مفکر اسلام علامہ قمر الزماں اعظمی مدظلہ العالی کا خصوصی خطاب ہوا اور دوسرا خصوصی خطاب امیر سنی دعوت اسلامی حضرت مولانا محمد شاکر نوری نے فرمایا۔ حضرت مولانا نے 'اخلاق کی اہمیت' کے حوالے سے قرآن کریم، احادیث نبویہ اور حالات حاضرہ کے تناظر میں اخلاق اور بد اخلاقی پر ایک زبردست خطاب فرمایا۔ قرآن کریم کی روشنی میں انہوں نے کہا کہ اللہ رب العزت نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: بے شک ہم نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا فرمایا۔ خالق کائنات نے جب دنیا کی دوسری چیزوں کو پیدا فرمایا تو فرمایا: کن فیکون مگر انسان کی تخلیق کے بارے میں فرمایا کہ میں نے انسان کو اپنے دست قدرت سے بنایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان کی اہمیت کیا ہے اور اللہ پاک انسان سے چاہتا کیا ہے۔ حضرت امیر سنی دعوت اسلامی نے کہا کہ اللہ نے انسانوں کے اندر ایسی صلاحیتیں رکھی ہیں جو دوسری کسی مخلوق میں نہیں، ان صلاحیتوں اور خوبیوں میں ایک اہم خوبی اخلاق حسنہ ہے۔ اچھے اخلاق والے کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے قائم اللیل اور صائم النہار کا درجہ دیا ہے۔ ایک حدیث کی روشنی میں حضرت موصوف نے کہا کہ قیامت کے دن میزان میں سب سے وزنی عمل حسنِ اخلاق کا ہوگا۔ قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب سے قریب اچھے اخلاق والا ہوگا اور سب سے دور برے اخلاق والا ہوگا۔

امیر سنی دعوت اسلامی مولانا محمد شاکر نوری نے بڑے افسوس کے ساتھ کہا کہ آج ایسا لگتا ہے کہ ہماری پوری سوسائٹی بد اخلاق ہو چکی ہے، اچھے اخلاق والے دور دور تک بھی نظر نہیں آرہے ہیں حالاں کہ ہمارے پیغمبر، پیغمبر اخلاق ہیں، ہمارا دین، دینِ اخلاق ہے اور ہماری روایت، روایت اخلاق مگر افسوس، ہم یہ سب فراموش کر بیٹھے ہیں۔ اس ذیل میں اپنی گفتگو آگے بڑھاتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ آج پوری دنیا میں برائیاں، نفرتیں اس لیے پیدا ہو چکی ہیں اور دوریاں اس لیے بڑھ گئی ہیں کہ لوگوں نے اخلاق حسنہ کو چھوڑ دیا ہے، ہم نے سختی اپنالی اور نرمی چھوڑ دی ہے اس لیے دلوں میں نفرتیں بڑھ گئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ آج کے معاشرے کا جو بحران ہے وہ صرف اچھے اخلاق اور نرمی سے ہی ختم ہو سکتا ہے۔ حضرت مولانا موصوف نے کہا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھے اخلاق والے کو زیادہ ایمان سے جوڑ دیا ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ تم میں سب سے زیادہ ایمان والا وہ ہے جو زیادہ اچھے اخلاق والا ہو۔ انہوں نے بڑے درد سے پیغام دیا کہ اپنے آپ کو بدلو، اپنے اخلاق اچھے کرلو، اپنے نبی کی تعلیمات کو اپناؤ تو ہمارے بہت سارے مسائل اور بہت ساری شکایات خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ اخیر میں انہوں نے ایک اصول بیان کرتے ہوئے کہا کہ جس قوم کے لوگ اخلاق پسماندگی کا شکار ہو جاتے ہیں وہ ہر میدان میں شکست وریخت کا شکار ہو جاتے ہیں اس لیے اگر شکست وریخت سے نکلنا ہے تو اچھے اخلاق اپنانے ہوں گے۔

مفتی محمد زبیر مصباحی (شیخ الحدیث دار العلوم غوثیہ ضیاء القرآن، کرلا، ممبئی) نے عوام کی طرف سے پوچھے گئے سوالات کے تشفی بخش جوابات دیے۔ آپ نے عقائد، نماز اور طلاق نیز دیگر بہت سارے مسائل پر تفصیلی گفتگو فرمائی۔ اس سے قبل ڈاکٹر مولانا احمد شیخ (ہیڈ آف ڈپارٹ مینٹ آف کیمسٹری مہاراشٹر کالج) نے قرآن وحدیث کی روشنی میں علم کی اہمیت پر بہترین خطاب کیا۔ مولانا سید امین القادری (مالیگاوں) نے فکر آخرت کے حوالے سے ایمان افروز خطاب کیا اور مسلمانوں کو اپنے دلوں میں خوف خدا پیدا کرنے کی تاکید فرمائی۔ آپ نے کہا کہ لوگوں کے دلوں سے آخرت کی فکر نکل گئی ہے جس کی وجہ سے گناہوں کے دلدل میں پھنستے جا رہے ہیں۔ نوجوان فحاشی اور

بے حیائی کے اڈوں پر نظر آرہے ہیں خوف خدااور فکر آخرت نہ ہونے کی وجہ سے۔ آقائے کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے لوگوں کے دلوں میں فکر آخرت پیدا فرمائی، اللہ کے عذاب سے ڈرایا جس کے نتیجے میں جنت کی بشارت پانے کے باوجود صحابہ کرام رات رات بھر آنسو بہایا کرتے تھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے نوجوان اپنے اندر خوف خدا پیدا کریں۔

مفکر اسلام علامہ قمر الزماں اعظمی مصباحی (لندن) نے 'علم کی اہمیت' پر نہایت فکر انگیز، پر مغز اور بصیرت افروز خطاب فرمایا۔ حقائق اور تاریخ کی روشنی میں حضرت مفکر اسلام نے بتایا کہ علم کیوں ضروری ہے اور آج کے دور میں اس کی اہمیت پہلے سے زیادہ کیوں بڑھ گئی ہے۔ علامہ اعظمی نے نہایت افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جس قوم کا آغاز اقراء سے ہوا تھا جس نے پوری دنیا کو پڑھایا اور سکھایا تھا اور دور رسالت سے لے کر پندرہویں صدی تک پوری دنیا جس کے سامنے زانوئے ادب طے کرتی تھی، وہ قوم آج علم سے دور ہے اور اسی وجہ سے پسماندگی اور زوال کی کھائی میں گر پڑی ہے۔ اس ضمن میں بڑے گہرے دکھ اور تشویش کے ساتھ انہوں نے بتایا کہ تن تنہا جاپان میں جتنی یونیورسٹیاں ہیں اتنی یونیورسٹیاں پورے عالم اسلام میں بھی نہیں ہیں۔ ہم مسلمانوں کے لیے اس سے زیادہ گہرے دکھ اور اضطراب کی بات کیا ہوسکتی ہے۔ حضرت موصوف نے یہ بھی کہا کہ قرآن مجید میں ۸۰ سے زیادہ مقامات پر علم کی تحصیل اور اس کے متعلقات کے بارے میں رہنمائی کی گئی ہے مگر ہم نے ان سب کو فراموش کر دیا ہے جس کا نتیجہ آج ہم سب کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔

حضرت علامہ نے غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا کہ اسلام سے پہلے کے عہد کو دور جہالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ دور جہالت کو دور کفر سے بھی تعبیر کیا جا سکتا تھا مگر آخر کیا وجہ ہے کہ اسلام سے قبل کو دور کو جاہلیت سے تعبیر کیا گیا۔ اس کا واضح مقصد یہ ہے کہ جہاں اسلام رہے گا وہاں جہالت نہیں رہے گی اور جہاں جہالت رہے گی وہاں اسلام نہیں۔ حضرت موصوف نے یہ بھی کہا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک چاچا کو ابوجہل کہا جاتا تھا اور یہ اسلام کے بدترین دشمنوں میں سے تھا۔ یہ ابوجہل سے ہی معروف ہوا حالاں کہ اس کو ابوالکفر بھی کہا جا سکتا تھا مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ جہالت ہی دراصل اس کے اسلام لانے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی رہی۔ انہوں نے کہا کہ جہالت ہی سبھی برائیوں کی جڑ ہے یہ جڑ اگر کاٹ دی جائے تو پھر ہمیں ترقی کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ حضرت مفکر اسلام نے اخیر میں سب سے عہد لیا کہ آؤ ہم سب علم کی راہ میں چلیں، علم کو فروغ دیں اور علم کے راستے کشادہ کریں تا کہ پسماندگی اور زوال کو دور بھگا سکیں۔

معروف نعت خواں الحاج قاری محمد رضوان خان صاحب اور قاری ریاض الدین اشرفی وغیرہ وقتاً فوقتاً اپنے حسین اور پر کشش آواز میں سامعین کے دلوں کو موہتے رہے۔ یہ اجتماع شب میں دس بجے اجتماعی دعاؤں پر ختم ہوا۔

□□□

پونے میں سنی دعوت اسلامی کا یک روزہ اجتماع

۲۶ مارچ پونے۔ اسلام میں علم کی بڑی اہمیت ہے، اس کی اہمیت حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے منوالی گئی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام کو انسانوں پر فضیلت کی ایک بڑی وجہ علم تھی۔ فرشتوں نے حضرت آدم کا سجدہ اس لیے کیا تھا کہ اللہ نے انھیں پوری کائنات کا علم دیا تھا۔ قرآن عظیم میں علم اپنے مشتقات کے ساتھ ۸۲ مقامات پر موجود ہے جب کہ اپنے مترادفات کے ساتھ سیکڑوں مقام پر موجود ہے۔ ہمارے اسلاف کی کتابیں مدتوں تک یوروپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ ہماری نظر میں اپنی وہ تاریخ بھی موجود ہے جب یوروپ وافریقہ کے بادشاہ اپنے بچوں کو لیے ہمارے علما اور صاحبان علم ودانش کے سامنے کاسہ گدائی لیے کھڑے ہوتے تھے۔ آج ہم علم بلکہ ہر میدان میں اتنا پس ماندہ ہو چکے ہیں کہ ہمارا زندہ اور ترقی یافتہ قوموں میں کہیں شمار ہی نہیں ہے۔ ہمارا ایک وہ سنہرا دور بھی تھا کہ ایک صدی کے اندر پیغمبر اعظم کے دیوانوں نے علم وتجربے کی بنیادوں پر دنیا کے تین براعظموں پر حکومت کی تھی۔ ابتدائے اسلام میں صرف ۱۷ صحابہ پڑھنا لکھنا جانتے تھے لیکن نبی امی معلم کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا تعلیمی انقلاب پیدا فرمایا کہ بوقت وصال تقریباً ایک لاکھ صحابہ کے ہاتھوں میں قلم اور کتاب موجود تھی۔ ہم نے دنیا کو شعور زندگی بخشا تھا، شعور حیات دیا تھا، جینے کا سلیقہ سکھایا تھا لیکن آج ہم اتنا پس ماندہ کیوں ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری قوت فکر وعمل پر زوال آچکا ہے، اس لیے ہم پس ماندہ ہیں۔ حضور مفکر

اسلام علامہ قمر الزماں اعظمی نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم میں سے ہر نوجوان اپنے علم کی زکوۃ نکالے ۔ چند بچوں کو پڑھانے کی ذمے داری لیں ۔ اسی طرح صاحبان ثروت غریب آبادیوں میں جا کر وہاں کا جائزہ لیں اور جو بچے غربت وافلاس کی وجہ سے اسکول نہیں جاتے ان کی تعلیم کا بندوبست کریں ۔ آپ نے النور اسکول کدل واڑی پونے کے ذمے داران کی ستائش کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ نے بہت عمدہ قدم اٹھایا ہے ، اللہ کامیابی دے ۔ اسی طرح آپ نے اسٹیج پر موجود علمائے کرام سے فرمایا کہ ہمارے علما دینی اور دنیاوی دونوں میدانوں میں امت مسلمہ کی قیادت کریں ۔ مدارس کے ساتھ ساتھ عصری اداروں کے قیام کی طرف توجہ دیں ۔ آپ نے فرمایا کہ ہمارے ننانوے فی صد بچے اسکولوں میں جاتے ہیں ، ہم ان کے ایمان وعقیدے کے تحفظ کے لیے کیا کر رہے ہیں ؟ کیا کبھی ہم نے اس جانب غور بھی کیا ؟

آپ نے فرمایا کہ آج بھی ہر مسلمان صرف علم کا ایک ایک چراغ روشن کر دے تو پوری دنیا کو علم کے اجالے میں لا سکتا ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ اس تعلیمی کانفرنس کے انعقاد پر مجھے دلی مسرت ہو رہی ہے کہ لوگ جلسے جلوس بہت کرتے ہیں لیکن آپ نے تعلیمی کانفرنس منعقد کی ہے ۔ کثیر تعداد میں عوام کے علاوہ علمائے کرام کی ایک بڑی تعداد کانفرنس میں موجود تھی ۔ علامہ موصوف سے قبل ہاشمیہ ہائی اسکول کے پرنسپل الحاج محمد رضوان خان مبلغ سنی دعوت اسلامی نے نصف گھنٹہ علم کی اہمیت وافادیت پر خطاب فرمایا جب کہ قاری محمد ریاض الدین اشرفی ممبئی نے تلاوت اور نعت رسول پیش فرمائی ۔ اسٹیج پر مولانا ڈاکٹر سعید احسن صاحب ، مولانا فیض احمد فیضی ، مولانا نصیب اللہ عزیزی ، مولانا عبدالمطلب صاحب ، مولانا مظہر حسین علیمی ، مولانا نعیم الدین نجمی ، مولانا عبدالمجید علیمی ، مولانا مقبول صاحب ودیگر مقامی علمائے کرام بڑی تعداد میں موجود تھے ۔

□□□

اجمیر شریف میں حضرت امیر سنی دعوت اسلامی کا خطاب

(اجمیر شریف) آج انٹرنیٹ اور اس کے دیگر ذرائع پر دوستی کا ایک بازار گرم ہے ۔ ہر کسی کو دوست بنانے کے لیے ہر شخص تیار اور آمادہ نظر آتا ہے جب کہ ایسے دوست ساز ایک دوسرے کی نفسیات ، حرکات وسکنات اور طبیعت ومزاج سے واقف نہیں ہوتے ۔ یوں کہہ لیجیے کہ فرینڈ شپ کا ایک بھوت سوار ہے ۔ کس کی دوستی دنیا وآخرت میں کام آئے گی اس کا ذکر بھی قرآن کریم میں چودہ سو سال سے موجود ہے ۔ سورہ زخرف کے آیت نمبر ۶۷ میں فرمایا گیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قیامت کے ہولناک دن گہرے دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے مگر پرہیزگار دشمن نہ ہوں گے ، وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے ، ان کے لیے خوف وہراس نہ ہوگا ۔

مولانا موصوف جمعہ کے اجتماع عظیم سے فرمایا کہ ہم اس وقت سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز کی بارگاہ میں حاضر ہیں ۔ یقیناً اولیائے کرام کی جماعت وہ جماعت ہے جن کی دوستی اور ان سے سچی محبت وعقیدت ہمارے کام آئے گی ۔ اللہ ورسول کی اطاعت اور اہل ایمان سے محبت بروز قیامت ضرور کام آئے گی ۔ سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز ہندوستان کی سرزمین پر تشریف لائے تو ہر چہار جانب کفر وشرک اور گمرہی کا دور دورہ تھا ۔ مسلمان بہت کم تھے ، اس وقت اسلام اور بانی اسلام کا نام لینا بھی انتہائی قسم کا جرم تھا ، ایسے پرآشوب اور پرفتن ماحول میں آپ نے اپنی دعوتی حکمت ومصلحت کے ذریعہ توحید ورسالت کا پیغام برصغیر ہند وپاک میں ایسا عام کیا کہ جس کے نتیجے میں نوے لاکھ غیر مسلم اسلام کے دامن آ گئے ۔ آج ہند وپاک میں ہر سمت اذانوں کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں یہ آپ اور آپ کے خلفا ومریدین کی دعوتی وتبلیغی محنتوں کا نتیجہ اور ثمرہ ہے ۔ وشرام استھل میں موجود ہزاروں سامعین کے لیے میرا پیغام یہ ہے کہ قرآن نے جن سے دوستی کا حکم دیا ہے انھی سے دوستی کرو اور جن سے دوستی کرنے سے منع فرما دیا ہے ان سے دوستی ہرگز نہ کرو ۔ ساتھ ہی خواجہ پاک کی تعلیمات پر عمل کرنے اور عام کرنے کا عہد کرو ۔

الحمد للہ ! ادھر کئی سالوں سے سنی دعوت اسلامی کے مبلغین اجمیر شریف میں زائرین خواجہ کی مختلف خدمات انجام دینے کے لیے سینکڑوں کی تعداد میں پہنچتے ہیں ۔ اصلاح ، دعوت وتبلیغ ، بھیڑ پر قابو پانے ، غریبوں اور پریشان حالوں کا تعاون جیسے اہم کام مبلغین انجام دیتے ہیں ۔ اس سال بھی بڑی تعداد میں نوری قافلے کی شکل میں بڑی تعداد میں مبلغین موجود ہیں ۔

(رپورٹ : مولانا مظہر حسین علیمی)

●●

منظومات

نتیجہ فکر: مولانا سلمان رضا فریدی مصباحی

کرم کی آتی ہے ، ہر سُو بہار، توبہ سے
عروج دیتا ہے پروردگار توبہ سے
بجھی ہے اشکِ ندامت سے آتش دوزخ
لگی ہے کشتیِ اعمال پار ، توبہ سے
بتا رہا ہے یہ ''تُوبُوا'' کا مختصر جملہ
خدا کو آتا ہے ، بندوں پہ پیار توبہ سے
خدا نے خود کو''غفورٌ رّحیم''فرمایا
کہ مجرموں کو نہ ہو، کوئی عار توبہ سے
در کریم پہ پتھر بھی بن گئے گوہر
بسے ہیں اجڑے دلوں کے دیار توبہ سے
نصیب ہوں گے خدا کی پناہ کے جلوے
قدم بڑھایئے بس بار بار توبہ سے
جبیں پہ خاکِ ندامت لگایئے تو سہی
بڑھے گا فکر و عمل کا وقار توبہ سے
پہن کے بیٹھیے پوشاک انکساری کی
اُتر ہی جائے گا عصیاں کا بار توبہ سے
کبھی بجھیں گےنہ کاشانۂ عطاکےچراغ
ملےگا علم وعمل کو نکھار توبہ سے
اِسی سےرب کی رضا پاگئے سری سقطی
ہوا ہے ولیوں میں انکا شمار توبہ سے
عنایت ایسی کہ "التائب کَمَنْ لاذنب
محبت ایسی کہ رب کوہے پیارتوبہ سے
عجب سکون ہے''لاتقنطوا'' کےسائے میں
کہ دل کو سیر نہیں ، بار بار توبہ سے
مرےقلم کےسب الفاظ سر جھکاےہوں
لباس فکر ، رہےتار تار توبہ سے
غرورسےہو، فریدیؔ کی زندگی محفوظ
رہے زبان و قلم کا حصار توبہ سے

شب براءت میں بندے کی التجائیں

یا رب ترے کرم کی دُہائی شب برات
بھردے مرا بھی دست گدائی شب برات
سوکھا ہوا ہے باغِ عمل اے مرے کریم
اس کو ملے ، بَہارِ عطائی شب برات
مجھ کوبھی، اپنی چادرِ رحمت میں ڈھانپ لے
کتنوں کی تونے لاج بچائی شب برات
ہم وار ہوں مرے لئے نیکی کے راستے
پٹ جائے ہر گناہ کی''کھائی'' شب برات
ٹوٹا ہے بارِغم سے، مرا پیکرِ وجود
مولیٰ توکردے، رنج کشائی شب برات
سارے فریب، نفس پرستی کے دور ہوں
دل سے دھلے،ہرایک بُرائی شب برات
ہوں سارے خوش عقیدہ مسلمان متّحد
مل جائے ہر''اِکائی، دَہائی'' شب برات
تو اپنی رحمتوں سے، بنادے اِنھیں گُہر
اشکوں کی بزم، ہم نے سجائی شب برات
تیرےکرم سے پایا ہے نیکوں نے جو مقام
اُس درپہ ہو مری بھی رسائی شب برات

▫▫▫

بندوں کومغفرت کاخزینہ ملاہےآج	اعمال کےصدف کونگینہ ملاہےآج
تعمیرہورہی ہےعطاوں کی کائنات	ہر قلب کوسرور کا سینہ ملا ہے آج
مجرم بھی جاسکیں گےکرم کی پناہ میں	پاےطلب کوفیض کا زینہ ملاہےآج
رکھ دیجئےجبین وفاچشم ترکےساتھ	مقبول بندگی کا قرینہ ملا ہے آج
فرمارہاہےرب،کہ میں راضی ہوں مومنو	یعنی سرورِلفظِ''رضینا'' ملاہےآج
لوگو!شبِ برات مبارک ہوآپ کو	دست کرم سےجامِ شبینہ ملاہےآج
سیراب ہورہےہیں غلامان مصطفی	میخانۂ رسول کا مینا ملا ہے آج

●●